www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

July-August 2026 • Rs. 50

جو لوگ جنگ کی باتیں کرتے ہیں وہ
صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے
امن کی طاقت کو دریافت نہیں کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

July-August 2026 | Volume 51 | Issue 4

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 50 per copy
Subscription by Book Post	₹ 250 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 450 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

وینزویلا کا زلزلہ 4
اسلام کا تصغیری فارم 5
اسلامی زندگی کیا ہے 6
خدا کا خوف 7
شخصیت کی تعمیر 8
محرومی، یافت 9
خدا کی نشانیاں 11
پازیٹو اثر لینا 13
رسول اللہ کا امی ہونا 14
پیدائشی قوم، فکری گروہ 15
یہود کی ایک روش 16
یک طرفہ رپورٹنگ 17
کلام کی دو قسمیں 18
مبنی بر خوف، مبنی بر فخر 19
مبنی بر مسائل، مبنی بر مواقع 20
تخلیقیت 22
کامیاب عمل کا راز 23
جدید اسلامی لٹریچر 24
ہمارا مشن 27
منفی ذہن کا قاتل 28
مشن کلچر، خواہش کلچر 29
ظلم کے خلاف مزاحمت 30
بے مسئلہ انسان 31
رائٹ ٹریک 32
تشکیل حیات 33
اسلامی مسلک 34
معاش کا مسئلہ 36
ریزرویشن کا طریقہ 37
امتیازی سلوک 38
وقت اور سمجھ 39
زندگی کا معاملہ 40
تربیتِ اولاد 41
کامیاب انسان 43
اعلان 44
انسان جاگ اٹھا 45
قیادت نامہ — ایک تبصرہ 47

हिकमत वाला तरीक़ा 1
चेतना का निर्माण 2
सफलता कैसे 3
एक नसीहत 5
क़ीमत का मसला 6
कर्म, न कि प्रतिक्रिया 7
गुस्सा न दिलाओ 8
अधिकार और लाचारी 10
अपनी कमज़ोरी 11
शरीर का सारा खून 12
खतरा नहीं 14
जोश बिना होश 15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

وینزویلا کا زلزلہ

24 جون 2026 کو وینزویلا کے شمال مغربی اور وسطی علاقوں میں اسٹرائیک سلِپ نوعیت کے دو شدید زلزلے آئے۔ ان زلزلوں کا مرکز وینزویلا کے شمالی یا شمال مغربی علاقے میں بتایا گیا۔ پہلا زلزلہ، جس کی شدت 7.2 (Mw) ریکارڈ کی گئی، مقامی وقت کے مطابق شام 6:04 بجے آیا۔ اسے ابتدائی جھٹکا (foreshock) قرار دیا گیا۔ اس کے صرف 39 سیکنڈ بعد 7.5 (Mw) شدت کا مرکزی زلزلہ (mainshock) آیا۔ ان زلزلوں نے ملک بھر میں وسیع پیمانے پر تباہی مچائی، خصوصاً لاگوائیرا اور دارالحکومت کاراکاس میں۔

زلزلہ ایسا فطری حادثہ ہے جس کے بارے میں انسان کی علمی ترقی کے باوجود درست پیشین گوئی ممکن نہیں ہے۔ موجودہ سائنس زلزلے کے وقوع کی تاریخ، وقت اور مقام کی قطعی پیشین گوئی نہیں کر سکتی۔ زلزلہ فطرت کا ایک تنبیہی ظاہرہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اچانک آئے گی (الاعراف، 7:187)۔ اِسی طرح زلزلہ بھی اچانک کسی پیشگی اطلاع کے بغیر آتا ہے۔ یہ اس بات کی پختہ یاددہانی ہے کہ انسان اس دنیا کا ماسٹر نہیں ہے، اس دنیا کا ماسٹر اللہ رب العالمین ہے۔ زلزلہ گویا چھوٹے پیمانے پر قیامت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ واقعہ اس امکانی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ایک دن پوری دنیا ایک ہولناک زلزلے کی زد میں آئے گی اور یہ سیارۂ زمین ہمیشہ کے لیے ناقابلِ رہائش بن جائے گا۔ یہی وہ عظیم حادثہ ہے جس کو قیامت کہا جاتا ہے۔ موجودہ زلزلہ چھوٹا زلزلہ ہے، جب کہ آئندہ آنے والی قیامت اس سے کہیں بڑا زلزلہ ہوگا۔

اِس دنیا میں چھوٹا زلزلہ اِس لیے آتا ہے تاکہ انسان ہوش میں آجائے اور بڑے زلزلہ کے لیے پیشگی تیاری کرے۔ یہ چھوٹے چھوٹے زلزلے گویا آئندہ آنے والے بڑے زلزلۂ قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں۔ چھوٹے زلزلے میں بظاہر کچھ لوگ بچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن جب قیامت کا بڑا زلزلہ آئے گا تو کسی بھی عورت یا مرد کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اُس سے بچا سکے۔ ہر زلزلے کے وقت انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مقابلے میں بالکل بے بس ہے۔ یہ چھوٹے زلزلے ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین وآسمان کا مالک کس طرح موجودہ دنیا کو ایک دن توڑ ڈالے گا اور اس کے بعد ایک نیا عالم بنائے گا۔ عقل مند وہ ہے، جو کل آنے والی غیر فانی دنیا کی تیاری کرے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

اسلام کا تصغیری فارم

ایک مغربی اسکالر نے مذاہب کا تاریخی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے نتیجۂ مطالعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا— مذہب ایک زندہ آئڈیالوجی کے طور پر شروع ہوتا ہے۔ لیکن کچھ نسلوں کے بعد مذہب ایک بے روح فارم بن جاتا ہے:

Religion begins as a living ideology, but after some generation, it is reduced to a lifeless form.

تاریخی اعتبار سے یہ بلاشبہ ایک حقیقت ہے۔ مسلمانوں کا بھی اس معاملے میں کوئی استثنا نہیں۔ دورِاول کے اہل ایمان نے جب اسلام کو اپنایا تو اسلام ان کی زندگیوں میں ایک زندہ آئڈیالوجی کے طور پر داخل ہوا۔ اسلام نے ان کی سوچ کو بدل دیا، ان کے طرز زندگی کو بدل دیا، ان کی پوری زندگی میں اسلام ایک متحرک عنصر بن کر شامل ہوگیا، اسلام ان کی زندگی کا واحد مشن بن گیا۔ مگر بعد کی نسلوں میں بگاڑ آیا۔ آج کی مسلم نسلوں میں بظاہر اسلام ہے، لیکن وہ صرف ایک بے روح کلچر ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں زندہ اسلام۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں کلمۂ شہادت محض کلمہ گوئی کے ہم معنی بن گیا ہے، نہ کہ حق کی دریافت کا اعلان۔ خدا کی کتاب ان کے لیے صرف کتابِ تلاوت ہے، نہ کہ کتابِ تدبر۔ ذکر ان کے یہاں وِرد کے ہم معنی ہے، وہ اللہ کی عظمتوں کو یاد کرنے کے ہم معنیٰ نہیں۔ دعوت ان کے یہاں مناظرہ (debate) کے ہم معنی ہے، نہ کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ خیر خواہی کے ہم معنیٰ۔ عبادت ان کے لیے ایک مقرر رسم کی ادائیگی کا نام ہے، وہ خداوند ذو الجلال سے قربت کے ہم معنی نہیں، وغیرہ۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے اندر جو یہ زوال آیا ہے۔ اس کو دور کرنے کا نام تجدید واحیا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال تجدید واحیا کے عمل کو زندہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں تجدید واحیا کا یہ کام روایتی انداز میں نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ تجدید کا یہ عمل عصر حاضر کی رعایت کرتے ہوئے کیا جائے۔ جس تجدید میں عصر حاضر کی رعایت شامل نہ ہو، وہ حقیقی معنوں میں تجدیدِ دین اور احیائے ملت کا عمل نہیں۔

اسلامی زندگی کیا ہے

اسلامی زندگی کیا ہے۔ اسلامی زندگی کسی قسم کے پراسرار فضائل میں عقیدہ رکھنے کا نام نہیں ہے۔ اسلامی زندگی یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے لیے ایک قسم کی ظاہری شناخت (identity) اپنا لیں۔ اسلامی زندگی کچھ بے روح قسم کے اعمال کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ اسلامی زندگی اسلام کے نام پر سیاسی ہنگامہ آرائی کرنے کا نام نہیں۔ اسلامی زندگی فقہی بحث ومباحثہ میں جینے کا نام نہیں۔ اسلامی زندگی یہ بھی نہیں کہ ملت کے نام پر کچھ قومی طرز کے کام کیے جائیں۔ اسلامی زندگی یہ نہیں ہے کہ آپ کا نام اسلام محمد یا دین محمد رکھ دیا جائے۔

اسلامی زندگی دراصل معرفت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے: رَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 660)۔ یعنی آخرت میں اللہ کی رحمت کے مستحق لوگوں میں سے ایک وہ انسان ہوگا جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ اس حدیث میں جو بات بتائی گئی ہے، بظاہر اس کا تعلق مسجد سے ہے، لیکن وہ ایک عام انسانی صفت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر انسان کی کوئی "مسجد" ہوتی ہے۔ اس کا دل ہر لمحہ اپنی اس مسجد سے اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کسی لمحہ اپنی اس مسجد سے غافل نہیں ہوتا۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ اللہ کی یاد میں جینے لگیں۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ اللہ سے ڈرنے والے اور اللہ سے محبت کرنے والے بن جائیں۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا سپریم کنسرن (supreme concern) بن جائے۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ جہنم سے بھاگیں۔ آپ سب سے زیادہ جنت کے طالب بن جائیں۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ کی زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے۔

اسلامی زندگی زمین پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ وہ خود انسان کے اپنے وجود پر قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ انسان رہتے ہوئے فرشتوں کے ماڈل کو اپنا لیں۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جائیں۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آپ کی شخصیت ایمان کے لحاظ سے درخت کے مانند ایک ترقی پذیر شخصیت بن جائے۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اسلام آپ کے پورے وجود کی پہچان بن جائے۔

خدا کا خوف

کتابوں میں عمر بن عبدالعزیز (61-101ھ) اور حسن بصری (21-110ھ) کے بارے میں آتا ہے کہ وہ دونوں سب سے زیادہ خوف رکھنے والے تھے، گویا کہ آگ انھیں دونوں کے لیے پیدا کی گئی ہو: مَا رَأَيْتُ أَخْوَفَ مِنَ الْحَسَنِ وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَأَنَّ النَّارَ لَمْ تُخْلَقْ إِلَّا لَهُمَا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 5، صفحہ 398)۔

اکابر اہل ایمان کے بارے میں عام طور پر اسی قسم کے اقوال کتابوں میں آئے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ یہ لوگ بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہوئے تھے۔ اس کا سبب غالباً اللہ رب العالمین کی عظمت کا احساس تھا۔ جس انسان کو اللہ رب العالمین کی معرفت حاصل ہوجائے، اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کے احساس میں جینے لگتا ہے۔ اللہ کی عظمت کا احساس اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ وہ بظاہر اللہ کی عظمت کے سوا کچھ اور سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔

اگر آپ صحرا (desert) میں ہوں، اور کبھی آفتاب (Sun) کو دیکھیں، جب کہ وہ کھلے آسمان میں بھر پور انداز میں دکھائی دے رہا ہو۔ تو آپ کے اوپر عجیب قسم کی دہشت طاری ہوجائے گی۔ اس وقت آپ اپنے وجود کو بھول جائیں گے، اور آپ کو صرف آفتاب کی بڑائی یاد آئے گی۔ اس تجربے سے بے حساب گنا زیادہ بڑا تجربہ وہ ہے، جب کہ بندۂ مومن کو اللہ رب العالمین کی ہستی کا ادراک ہوجائے۔ وہ اللہ کی عظمت کے احساس سے کانپ اٹھے گا۔ اس کو اپنا وجود اتنا حقیر دکھائی دے گا، گویا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی تجربہ زیادہ بڑے درجے میں اہل ایمان کو اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ اللہ رب العالمین کی عظمت میں جینے والے بن گئے ہوں۔ اللہ رب العالمین کی عظمت تمام عظمتوں سے زیادہ عظیم ہے۔ اس کا تجربہ آپ اس طرح کرسکتے ہیں کہ آپ قرآن کی آیت الکرسی (البقرۃ، 2:255) کو گہرے احساس کے ساتھ پڑھیں۔

شخصیت کی تعمیر

قرآن میں انسان کے لیے دو قسم کے رزق کا ذکر آیا ہے۔ ایک رزق کا ذکر ان الفاظ میں ہے: (ترجمہ) اور زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو (11:6)۔ اس آیت میں جس رزق کا ذکر ہے، یہ وہ ہے جو زمین سے اگتا ہے۔ اس زمینی رزق کا فائدہ ہر انسان کو یکساں طور پر پہنچتا ہے۔ یہ رزق انسان کے لیے جسمانی صحت وطاقت کا ذریعہ ہے۔

دوسرا رزق وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: (ترجمہ) اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے انھیں دنیا کی رونق دے رکھی ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے (20:131)۔ اس آیت میں جس رزق کا ذکر ہے، اس سے مراد اصلاً اناج اور پھل وغیرہ جیسی چیزیں نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ رزق ہے جو توسم اور غور وفکر کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس سے وہ رزق مراد ہے جو ساری کائنات میں سبق کے روپ میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ زمین وآسمان میں غور کرے، اور غور کرکے زمین وآسمان میں پھیلے ہوئے اس رزق کو اسی طرح اپنائے، جس طرح شہد کی مکھی پھولوں میں رکھے ہوئے نکٹر کو اپناتی ہے۔

پہلا رزق اگر مادی رزق ہے تو دوسرا رزق ربانی رزق ہے۔ پہلے قسم کے رزق سے اگر انسان کو جسمانی طاقت ملتی ہے تو دوسری قسم کے رزق سے انسان کی معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان کو اپنے رب کے بارے میں یقین حاصل ہوتا ہے۔ انسان کی آخرت کی زندگی میں ترقی ہوتی ہے۔ انسان کے جنت کے شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان کے عقلِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ انسان کی شخصیت ایمانی ترقی کے مراحل سے گزرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ جنتی شخصیت بن جاتی ہے۔ انسان صبر کی اہمیت کو دریافت کرتا ہے۔ انسان قناعت اور توکل کی غذائیں حاصل کرتا ہے۔ انسان کے اندر وہ شخصیت پیدا ہوتی ہے، جو خوف خدا، اور محبت انسانی، اور فکر آخرت میں پرورش پا کر اپنے رب کی قربت حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان اس قابل بن جاتا ہے کہ اس پر جنت کے دروازے کھول دیے جائیں۔

محرومی، یافت

میرے والد کا نام فرید الدین خاں تھا، وہ گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ان کا انتقال 29 دسمبر 1929 کو ہوا۔ وہ چھاؤنی پر گئے ہوئے تھے۔ واپس آرہے تھے۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔ اس میں ان کو اسٹروک ہوا۔ اس کو ہم فالج کہتے تھے۔ رات کا وقت تھا وہ چلتے ہوئے گر پڑے۔ جو مزدور ان کے ساتھ چل رہے تھے اس میں ایک تھا بُٹلی ۔ جب ہمارے والد گر پڑے تو بٹلی نے چلا کر اپنی دیہاتی زبان میں کہا: چاچا گر پڑلیں، چاچا گر پڑ لیں۔ تو اس کے بعد چار پائی لائی گئی۔ اور ان کی باڈی کو اٹھا کر گاؤں لایا گیا۔

ہمارا گاؤں چھاؤنی سے تقریباً 2 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میرے والد مجھ کو بہت زیادہ مانتے تھے۔ میں بہت زیادہ بولتا تھا۔ زیادہ تر انھیں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب والد صاحب کی وفات ہوئی تو ان کو میں نے دیکھا کہ چار پائی پر ان کی باڈی لٹائی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں ایک دم سکتہ میں آ گیا۔ میں رویا نہیں، مجھے رونا نہیں آیا بلکہ سکتہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے میرا بولنا بند ہو گیا۔

بولنا بند ہونے کے معنی کیا تھے۔ پہلے میں بولنے والا تھا، اب میں سوچنے والا بن گیا۔ یعنی باپ کی زندگی میں میں بہت بولنے والا تھا، مگر اب بہت سوچنے والا بن گیا۔ اس کے بعد میری حالت یہ ہوگئی کہ میں ہر وقت خاموش رہتا اور گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ یعنی باپ کی ڈیتھ میرے لیے سپر شاک تھی۔ اس سے بڑا شاک میری زندگی میں کبھی پیش نہیں آیا۔

جب میں نے دیکھا کہ میرے باپ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ تو یہ تجربہ میرے لیے سب سے بڑی ڈسکوری بن گیا۔ کیونکہ میں نے اگرچہ شعوری طور پر نہیں، بلکہ غیر شعوری طور پر یہ دریافت کیا کہ باپ مر گیا لیکن خداوند رب العالمین زندہ ہے۔ اس طرح گویا مجھے ایبسنس آف فادر سے پریزنس آف گاڈ کا تجربہ ہوا۔ یہ اچانک شاک تھا، اور اس سے میرے مائنڈ نے، میری روح نے جو چیز ڈسکور کی، وہ تھی ایبسنس آف فادر سے پریزنس آف گاڈ کا تجربہ۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کے بعد میری پوری زندگی خدا کی تلاش میں ڈھل گئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ

میں فادر کے انتقال کے بعد ایک متلاشی انسان بن گیا۔ پہلے میں سیکر (seeker) بنا، پھر میں نے اللہ کو دریافت کیا۔ میرا سب سے بڑا تجربہ باپ کی موت تھا۔ اس کے بعد میری سب سے بڑی دریافت اللہ رب العالمین کی ڈسکوری تھی۔ یہ ڈسکوری کا جو تجربہ تھا، یہ شروع ہوا باپ کی موت کے بعد اور وہ آج تک جاری ہے۔ آج بھی جب میں سو کر اٹھا تو اسی احساس کے ساتھ اٹھا۔ یہ میری کہانی ہے۔

میری سب سے بڑی محرومی میرے تجربے کے لحاظ سے باپ کی موت تھی، مگر اس محرومی نے مجھے جس دریافت تک پہنچایا، وہ اللہ رب العالمین کی ڈسکوری تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت سے میں اللہ میں جینے والا بن گیا۔ پہلے میں باپ میں جینے والا انسان تھا، اس کے بعد میں اللہ میں جینے والا انسان بن گیا۔

میری روح پر اور پوری زندگی پر یہی سوچ غالب رہی اور آج بھی یہی سوچ غالب ہے۔ میری ساری کتابیں چاہے اس کا عنوان کچھ بھی ہو، لیکن ان سب کا مشترکہ موضوع (theme) ایک ہی ہے، اور وہ اللہ رب العالمین کی معرفت ہے۔ یعنی باپ کی موت تک میرا سب کچھ میرا باپ تھا اور باپ کے انتقال کے بعد اللہ میرا سب کچھ بن گیا۔ یہ گویا ایک ٹرانسفارمیشن تھا۔ بلکہ ایک اعلیٰ قسم کا ٹرانسفارمیشن تھا۔

باپ کو لے کر سوچنے والا انسان چھ سال کی عمر میں خدا کو لے کر سوچنے والا انسان بن گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اپنی لائف لکھو، تو میری لائف تو بس یہی ہے۔ اور کیا لکھوں میں۔ یعنی باپ کا ایسینس میرے لیے گاڈ کا پریزنس بن گیا۔ یہی میری لائف ہے۔ میرا سب سے بڑا تجربہ باپ کی موت تھی اور اس کے بعد میری سب سے بڑی ڈسکوری خدا کی دریافت بن گئی۔

اس وقت میں یوپی کے ایک گاؤں میں تھا۔ آج جو میں بول رہا ہوں تو نئی دہلی کی ایک بلڈنگ سے بول رہا ہوں، جہاں میں اس وقت رہتا ہوں۔ یہ ایک لمبا سفر ہے۔ اس سفر کی ہر صبح ہر شام ہر لمحہ اسی تجربے میں گزرا ہے۔ اور اب جب کہ میں اپنی عمر کے آخری حصے میں ہوں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ رب العالمین میری واحد دریافت ہے، اول بھی اور آخر بھی۔ یہی میرے لیے شروع بھی ہے، یہی میرے لیے ختم بھی۔ اور اپنی زندگی کے بارے میں میرے پاس کچھ کہنے کے لیے نہیں۔ (23 نومبر 2018)

خدا کی نشانیاں

ستمبر 1982 کی سات تاریخ تھی۔ میں افریقہ کے ایک پہاڑی علاقہ میں ایک درخت کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ درخت میرے لیے نیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس قسم کا درخت نہیں دیکھا تھا۔

درخت اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی نشانی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ہر چیز میری نظر میں عجیب تھی، اس کا نازک پھول، اس کا ترشا ہوا پھل، ریاضیاتی کاریگری کے ساتھ بنی ہوئی اس کی پتیاں تمام چیزیں پکار رہی تھیں کہ وہ اپنے آپ نہیں اُگ آئی ہیں، بلکہ کسی بنانے والے نے ان کو بنایا ہے۔ اس دنیا کا ہر درخت صنعت گری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مگر مذکورہ درخت پہلی بار میرے سامنے آیا اس لیے وہ خصوصی طور پر میرے لیے اثر انگیز ثابت ہوا۔

افریقہ کے اس عجیب اور حسین درخت کو دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائیں ان میں سے ہر چیز پر اس نے یہ لکھ دیا:

Made by God

(خدا کا بنایا ہوا)۔ خدا نے چیزوں پر یہ لکھا اور اس کے بعد اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپا لیا۔ تاکہ لوگ مخلوق کو دیکھ کر خالق کو پہچانیں، تاکہ غیب کے باوجود لوگ اس دنیا میں خدا کی موجودگی کو پالیں۔

ایک شخص جو مشینوں کا ماہر ہو وہ ایک مشین کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ مشین روس کی بنی ہوئی ہے یا امریکا کی، برطانیہ کی بنی ہوئی ہے یا جاپان کی، چین کی بنی ہوئی ہے یا ویتنام کی۔ ٹھیک یہی معاملہ کائنات کی تمام چیزوں کا ہے۔ ہم ایک ایسی کائنات میں رہتے ہیں جہاں بے شمار قدرتی ”مشینیں“ موجود ہیں، اور ہر ایک مسلسل اپنا کام کر رہی ہیں۔ یہ وسیع اور عظیم کائنات مسلسل طور پر متحرک ہے۔ اس کے اندر ہر لمحہ انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں (meaningful activities) جاری ہیں۔ اسی طرح جدید سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات ناقابل قیاس حد تک وسیع ہونے کے باوجود آخری حد تک ایک ہم آہنگ (harmonious) کائنات ہے۔ وہ مکمل طور پر ایک واحد

فورس سے کنٹرول ہورہی ہے۔ اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے کامل طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ کائنات کی اِس عالمی ہم آہنگی پر تمام سائنس داں حیرت زدہ ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس غیر معمولی ہم آہنگی کی توجیہ کس طرح کی جائے۔

ان ’’مشینوں‘‘ پر بظاہر ان کے خالق کا ٹھپہ نہیں لگا ہوا ہے، مگر اپنی غیر معمولی بناوٹ اور ناقابلِ بیان حد تک ممتاز کارکردگی کی وجہ سے وہ اپنی ساخت کا آپ اعلان ہیں۔ مخلوقات خود اپنے خالق کو بتا رہی ہیں۔ کائنات میں موجود حیرت انگیز ڈیزائن، بے پناہ نظم، انتہا درجہ کی معنویت اِس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ یہ کائنات ایک ذہین قادرِ مطلق خدا کے چلانے سے چل رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پوری کائنات ایک لمحے کے اندر منتشر ہو کر رہ جائے۔ کائنات کے اندر یہ کامل ہم آہنگی صرف اُس وقت ممکن ہے، جب کہ اُس کا ناظم اپنے اندر اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور قدرتِ کاملہ کی صفت رکھتا ہو۔

کائنات کی کسی چیز کے اوپر لفظوں میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ اس کو کس نے بنایا۔ مگر معنوی طور پر ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا موجود ہے۔ تخلیق کے ہر جزء پر خالق کی اسٹیمپ (stamp) لگی ہوئی ہے۔ اگر دیکھنے والی نگاہ ہو تو آدمی ہر چیز کو دیکھ کر پکار اٹھے گا: بلاشبہ یہ خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا اس کو بنا نہیں سکتا۔ ایک جرمن سائنس داں پروفیسر کارل ٹرال (1899-1975) نے کہا— میری زندگی کا حاصل بحیثیت سائنٹسٹ اور جغرافیہ داں یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ خالق کا شکر گزار ہو گیا ہوں:

"The fruit of my life as a scientist and geographer is to have become more and more deeply grateful to our Creator."

کسی شخص کا اصل معبود وہی ہے جس کو اس نے اپنے حب شدید کا مرکز بنایا۔ جس نے کسی کو اپنے قلبی تعلق کا تحفہ دیا، وہی اس کا معبود ہے۔ ایسا آدمی اگر زبان سے اللہ کو اپنا معبود بتاتا ہے، لیکن اس کا قلبی تعلق کسی اور سے ہے تو وہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (الصّف، 61:2) کا مصداق ہے۔ یعنی، قلبی تعلق کسی اور کو دینا، اور زبان سے اللہ کو اپنا معبود بتانا۔

پازیٹو اثر لینا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کئی غزوات پیش آئے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو احد کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں میں سے ستر آدمی مارے گئے تھے، اور ستر زخمی ہوئے تھے، یہاں تک کہ رسول اللہ بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اس مناسبت سے یہ آیت نازل ہوئی: فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ (3:153)۔ یعنی، پھر اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے کھوئی گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تم پر پڑے۔

اس موقع پر قرآن میں یہ نصیحت کی گئی، تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے کھوئی گئی:

So that you might not grieve for what you lost.

یہاں رنجیدہ برائے رنجیدہ نہیں ہوسکتا۔ ضرور ہے کہ رنجیدہ نہ ہونے کا کوئی مثبت مقصد ہو۔ وہ مقصد یہ ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر جو کچھ پیش آیا، وہ بظاہر ایک منفی واقعہ تھا، لیکن تم کو چاہیے کہ اس منفی واقعہ کو مثبت تجربہ میں بدلو۔ ایسا کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ لوگ پوری طرح غیر متاثر ذہن کے تحت پورے معاملے پر سوچیں، اور خالص سوچ کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچیں کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ وہ نئی زندگی کا آغاز ہے۔

مصیبت پر رنجیدہ نہ ہونا، کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی اپنی جسمانی مصیبت کو ذہنی مصیبت نہ بنائے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ جو کچھ اس سے چھن گیا ہے، اس کے غم میں اپنا یہ حال کرلے کہ جو کچھ اب بھی اس کے پاس باقی ہے، وہ اس سے غافل ہوجائے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کھوئی ہوئی چیز کو فراموشی کے خانے میں ڈالے، اور جو کچھ اب بھی اس کے پاس بچا ہوا ہے، اس کو لے کر اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک کو نقصان کا تجربہ ہوتا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو باقی ماندہ امکانات کو جانے، اور اس کی بنیاد پر اپنے لیے نئی زندگی کی تعمیر کرے۔ اسی کا نام دانش مندی ہے، اور یہی دانش مندی اس دنیا میں کامیابی کا حقیقی راز ہے۔

رسول اللہ کا امی ہونا

پیغمبر اسلام ایک اُمّی رسول تھے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ امی ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر حروف شناسی کا مادہ نہ تھا۔ حروف شناسی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ لکھ سکے، اور پڑھ سکے۔ پیغمبر اسلام لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے، مگر آپ کا کلام بتاتا ہے کہ آپ اعلیٰ درجے کی عربی زبان بولنے پر قادر تھے۔

مثلا آپ کا ایک قول یہ ہے: مَا رَأَيْتُ مِثْلَ الْجَنَّةِ، نَامَ طَالِبُهَا، وَمَا رَأَيْتُ مِثْلَ النَّارِ، نَامَ هَارِبُهَا (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 1638)۔ یعنی، میں نے نہیں دیکھا جنت کے مثل کہ اس کا طالب سویا ہوا ہے، اور نہیں دیکھا جہنم کے مثل کہ اس سے بھاگنے والا سویا ہوا ہے۔ آپ کے اس قول میں فصاحت و بلاغت اعلیٰ درجے کی موجود ہے۔ اسی طرح آپ کی وہ تقریر جو آپ نے غزوۂ حنین کے بعد کی تھی، عربی ادب کی تاریخ میں اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح کی مثالیں آپ کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ رسول اللہ کی حروف شناسی میں دو رائے ہوسکتی ہے، لیکن جہاں تک عربی زبان کا معاملہ ہے، آپ کی زبان دانی ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہے۔

تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، جب کہ ایک شخص لکھنے پڑھنے سے محروم ہونے کے باوجود زبان دانی کی اعتبار سے باکمال حیثیت رکھتا ہو۔ اس کی ایک مثال انگریزی کا شاعر جان ملٹن (1608-74) ہے۔ ایک بیماری کے نتیجے میں اس کی بینائی مکمل طور پر چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ 44 سال کا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے سے محروم ہوچکا تھا۔ لیکن اسی زمانے میں اس نے ایک طویل نظم لکھی تھی، جو فردوس گم شدہ (Paradise Lost) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب پوری کی پوری املا کے ذریعہ لکھی گئی ہے۔ لیکن اسے انگریزی زبان میں ماسٹر پیس (masterpiece) سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جو لکھنے اور پڑھنے سے محروم ہونے کے باوجود زبان دانی میں اعلیٰ صلاحیت کا مالک ہوسکتا ہے۔

پیدائشی قوم، فکری گروہ

قرآن میں ایک حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:62)۔ یعنی، بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لیے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں مختلف قومی گروہوں کو لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اگر پیدائشی تعلق کی بنا پر امت محمد یا امت موسیٰ سے وابستہ ہو گئے ہوں تو اس قسم کی پیدائشی وابستگی نجات کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ آخرت کی نجات ذاتی دریافت (self discovery) کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ محض پیدائشی تعلق کی بنا پر۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ پیدائشی ایمان انسان کی نجات کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ آدمی اگر پیدائش اعتبار سے مسلم قوم کے اندر پیدا ہوا ہو تب بھی اس کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ ذاتی مطالعہ سے اپنے دین کو دوبارہ دریافت (rediscover) کرے۔ اللہ کے نزدیک دریافت کردہ ایمان کا اعتبار ہے، نہ کہ پیدائشی قومیت کے اعتبار سے ملا ہوا ایمان۔

دین وہی قابل اعتبار ہے جو پیغمبر کے زمانے میں براہ راست پیغمبر سے کسب فیض کے ذریعہ آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی آدمی کے اندر تلاش کی اسپرٹ پیدا ہو، وہ اپنی زندگی پر نظر ثانی کرے، وہ غور و فکر کے ذریعہ ایک طرز زندگی کو چھوڑے، اور دوسری طرز زندگی کو اختیار کرے۔ وہ غور و تدبر کے ذریعہ پیدائش کی بنیاد پر ملے ہوئے دین کو خود دریافت کردہ دین بنائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُو (4:136)۔ یعنی، اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

یہود کی ایک روش

یہود کی ایک روش کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (6:91)۔ یعنی، یہود کو جو آسمانی کتاب دی گئی تھی، اس کو انھوں نے ورق ورق کردیا۔ کچھ کو ظاہر کیا اور زیادہ کو ظاہر نہیں کیا۔

اس آیت میں ”قرطاس“ سے مراد کاغذ ہے، یعنی ایک مادی چیز۔ یہاں بظاہر کاغذی اور مادی تقسیم کا ذکر ہے، مگر اصل اشارہ معنوی تقسیم کی طرف ہے۔ یہود کے دورِ زوال میں یہی ہوا کہ انھوں نے دینِ خداوندی کی روح کو اس کے فارم سے جدا کردیا۔ اس دور میں ان کے علما اور مشائخ، یعنی احبار و رہبان، دینِ خداوندی کے فارم کا خوب چرچا کرتے تھے، لیکن دینِ خداوندی کی اسپرٹ کا ان کے یہاں کوئی چرچا نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینِ خداوندی، جو اصلاً اسپرٹ پر مبنی دین تھا، عملاً فارم پر مبنی دین بن گیا۔

یہ جو کچھ ہوا، وہ اصلاً ”یہودیت“ کا ظاہرہ نہیں تھا، بلکہ وہ دورِ زوال کا ظاہرہ تھا۔ ہر امت کے ساتھ اس کے دورِ زوال میں یہی واقعہ پیش آتا ہے، حتی کہ خود امتِ مسلمہ کے ساتھ بھی۔

قرآن کی اِس آیت کو مزید وضاحت کے ساتھ جاننا ہو تو آپ بائبل کا مطالعہ کیجیے۔ بائبل کے مطالعے سے یہ بات تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتی ہے۔ یہود دینِ خداوندی کے معنوی پہلو کو چھوڑے ہوئے تھے اور دین کے ظاہری پہلو کو اِس طرح بیان کرتے تھے جیسے کہ وہی اصل دین ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت مسیح نے تمثیل کی زبان میں اِس طرح بیان کیا تھا کہ اے اندھے راہ بتانے والو، تم مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو:

You blind guides! You strain out a gnat but swallow a camel. (Matthew, 23:24)

یک طرفہ رپورٹنگ

آج کل جس مسلمان سے بات کیجیے، وہ ہمیشہ ایک ہی بات کو دہرائے گا، اور وہ مسلمانوں پر ظلم کی بات ہے۔ اگر ان سے مزید گفتگو کیجیے تو وہ نیوز پیپر کی خبروں کا حوالہ دے گا۔ اخباری خبریں کیا ہیں۔ وہ یک طرفہ خبر رسانی کی مثال ہیں۔ قرآن کے مطابق، اس قسم کی یک طرفہ خبروں کو مان لینا درست نہیں ہے، بلکہ رائے بنانے سے پہلے غیر جانبدارانہ انداز میں ان کی تحقیق کر لینی چاہیے۔

جو لوگ اس قسم کی یک طرفہ خبروں کی بنیاد پر ظلم کی داستان سناتے ہیں، یا اسلاموفوبیا (islamophobia) کی باتیں کرتے ہیں، ان سب پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی، اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد وہ انسان ہے، جو یک طرفہ رپورٹنگ کرتا ہے، یعنی جو سنا، بس اس کو تحقیق کے بغیر دہرانے لگا۔ موجودہ زمانے میں یک طرفہ رپورٹنگ کا انداز اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید اس میں کوئی استثنا نہیں۔ حتی کہ جب وہ جوش وخروش کے ساتھ ایک خبر بتا رہے ہوتے ہیں، تو ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ یک طرفہ رپورٹنگ کی غلطی کر رہے ہیں، اور یک طرفہ رپورٹنگ اسلام میں جائز ہی نہیں۔

موجودہ زمانے میں تقریباً تمام مسلمان اسی یک طرفہ رپورٹنگ کے شکار ہیں۔ یک طرفہ رپورٹنگ کا یہ طریقہ بلاشبہ ایک جرم ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ فسق کا معاملہ ہے۔ وہ آدمی کے فاسقانہ کردار کو بتاتا ہے۔ یک طرفہ رپورٹنگ ناقص مطالعہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یک طرفہ رپورٹنگ اور ذہنی ارتقا دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یک طرفہ رپورٹنگ سے آدمی کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل رُک جاتا ہے۔ آدمی تخلیقی فکر (creative thinking) سے محروم ہو جاتا ہے۔

کلام کی دو قسمیں

کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جب کہ متکلم بولنے سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ سامع یا قاری کا ذہن کیا ہے، اور اس کا کنسرن یہ ہو کہ اس کی بات فریقِ ثانی کے ذہن کو ایڈریس کرے۔ یعنی وہ پہلے خود موضوعِ کلام پر غور کرے، اور اچھی طرح سوچنے کے بعد اپنی بات اس انداز میں پیش کرے کہ سننے یا پڑھنے والے کو اس سے کوئی واضح ٹیک اوے (takeaway) حاصل ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں جو الفاظ ہوں، ان الفاظ کو آپ لکھنا یا بولنا شروع کر دیں، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ فریقِ ثانی کو اس میں کوئی ٹیک اوے ملے گا یا نہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ لکھنے والے یا بولنے والے لوگ زیادہ تر سوچے بغیر بولتے ہیں۔ اس وجہ سے مقرر یا محرر کی باتیں عام طور پر وضوح (clarity) سے خالی ہوتی ہیں، اور جب کلام یا مضمون میں وضوح نہ ہو، تو پڑھنے یا لکھنے والے کے لیے اس میں کوئی ٹیک اوے کیسے مل سکتا ہے۔

صحیح مقرر یا محرر وہ ہے جو زیرِ بحث بات پر پہلے خود سوچے، وہ اس کو پوری طرح ہضم کرے، اور اپنے جواب سے پہلے بات کے مالہ و ماعلیہ پر اچھی طرح غور کرے، اور پھر اپنے جواب کا اظہار کرے۔ گویا پہلے اپنے آپ کو مخاطب بنائے، اور اس کے بعد دوسرے شخص کو۔ مگر یہ اہم صفت عام طور پر مقرر یا محرر کے یہاں موجود نہیں ہوتی۔ یہ بات میں ذاتی تجربے کے بعد کہہ رہا ہوں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی کی ایک بات سنتے ہیں، یا کسی کی ایک بات کو پڑھتے ہیں، اور جب میں ان سے اس بات کا خلاصہ پوچھتا ہوں، تو وہ صحیح طور پر اس کا جواب نہیں دے پاتے۔ کیوں کہ جو تقریر انھوں نے سنی ہے، یا جو مضمون پڑھا ہے، اس میں وضوح نہیں ہوتا، جس سے وہ کہی ہوئی باتوں کو سمجھیں، اور ان کا مائنڈ اس سے ایڈریس ہو۔

وضوح کسی تحریر یا تقریر کی اہم صفت ہے۔ یہ طریقہ عین قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَقُلۡ لَّهُمۡ فِيٓ أَنفُسِهِمۡ قَوۡلَۢا بَلِيغٗا (4:63)۔ یعنی ان سے ایسی بات کہو، جو ان کے دل میں اتر جانے والی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فرد کے مائنڈ کو ایڈریس

کرے۔ مجیب کا جواب ایسا ہونا چاہیے کہ اگر وہ آپ کے جواب سے اتفاق نہ کرے، تب بھی آپ کے جواب میں اتنا وضوح ہونا چاہیے، کہ سامع اس کو بخوبی طور پر سمجھ جائے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ جواب ایسا ہونا چاہیے جو سائل کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔

مبنی بر خوف، مبنی بر فخر

اسلام کے ماننے والوں کا دین اگر خوفِ خدا اور مسئولیت (accountability) پر قائم ہو، تو وہ صراط مستقیم پر ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں اسلام اپنی حقیقی صورت میں قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس، جب ان کا دین فخر (pride) پر قائم ہو جائے تو وہ صراط مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کا اسلام قومی اسلام بن جاتا ہے۔ وہ اس اسلام سے دور ہو جاتے ہیں جو اللہ تعالی کو مطلوب ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اصحابِ رسول کا نمونہ، اسلام کی حقیقی صورت کو بتاتا ہے۔ اصحابِ رسول کا اسلام خوفِ خدا کی اسپرٹ پر قائم تھا۔ اسی لیے اسلام میں ان کو ماڈل کا درجہ حاصل ہے (القدوۃ هم)۔ بعد کے زمانے میں جب مسلمانوں کی تعداد بڑھی اور دنیا میں ان کا سیاسی ایمپائر قائم ہو گیا، اس وقت سے مسلمانوں کے مزاج میں آہستہ آہستہ ایک تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اب یہ ہوا کہ جو مسلم مائنڈ پہلے خوفِ خدا کے مزاج سے بنا تھا، وہ مسلم مائنڈ اب فخر کے مزاج کے تحت بننے لگا۔ اس طرح بعد کے مسلمان اپنی سیاسی عظمت (political glory) میں جینے لگے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ عام طور پر فخر کی نفسیات میں جیتے ہیں۔ وہ اسلام کو اپنے لیے فخر کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔ یہ اسلام، مسلمانوں کی سیاسی تاریخ سے ماخوذ اسلام ہے، وہ خود اسلام سے ماخوذ اسلام نہیں۔ ایسے مسلمانوں کو صرف ایک ہی چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور وہ ہے، عہد رفتہ (past) کی عظمت کا تذکرہ کرنا یا اس کی طرف واپسی کی مہم چلانا۔

مگر فخر پر مبنی اسلام کی خدا کے یہاں کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کے یہاں مقبول اسلام وہ ہے، جو خدا کے ساتھ محبت اور خوف کے احساس پر قائم ہو، جو خدا کی دریافت پر مبنی ہو، نہ کہ سیاسی عظمت کی دریافت پر۔ سچا اسلام وہ ہے، جو آدمی کے لیے اس کے دل کی تڑپ بن جائے۔

مبنی بر مسائل، مبنی بر مواقع

مریم جمیلہ (Margret Marcus) امریکا کے ایک یہودی خاندان میں 1934ء میں پیدا ہوئیں، اور 2012ء میں پاکستان میں ان کی وفات ہوئی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے 1961ء میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پاکستان آگئیں، اور وہاں انھوں نے ایک پاکستانی مسلمان، محمد یوسف خان سے شادی کی۔ ان کے متعلق ماہنامہ زندگی نو، جنوری 2017 میں ایک مفصل مضمون ”مریم جمیلہ: مغربی فکر وتہذیب کی بے باک ناقدہ“ شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979) کے ساتھ اپنے استفادہ کا واقعہ مریم جمیلہ نے یوں بیان کیا گیا ہے:

> میرے خان صاحب (شوہر) مجھے عصر کے وقت سید مودودی کے گھر (روزانہ) باقاعدگی کے ساتھ لے جاتے تھے۔ میں وہاں رات کا کھانا کھاتی، اور مغرب سے عشاء تک مولانا مودودی اور میں باہم مختلف معاملات پر گفتگو کرتے رہتے۔ ہر بحث تمام موضوعات پر مشتمل ہوتی۔ زیادہ تر وقت ہم پاکستان میں سیاسی صورت حال اور مسلم دنیا کے مختلف حصوں میں معاندانہ حکومتوں کے تحت اسلامی تحریکات کی حالت زار پر بحث کرتے۔ (صفحہ 82)

مریم جمیلہ کا کیس بتاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں کی وہ کون سی فکری غلطی تھی، جس نے موجودہ زمانے کے قیمتی مواقع کو غیر استعمال شدہ مواقع (unavailed opportunities) بنا کر رکھ دیا، اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ مواقع کے انفجار (explosion) کے زمانے میں صرف نفرت اور تشدد میں جینے والے بن کر رہ جائیں۔

اندازہ یہ ہے کہ استفادہ کی یہ مدت مولانا مودودی صاحب کی وفات تک جاری رہی۔ اس اعتبار سے استفادہ کی یہ مدت تقریباً پندرہ سال پر محیط ہے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے تقریباً

تمام مذہبی رہنما یہی کام کرتے رہے۔ پاکستانیوں کے ذہن کو منفی خوراک دینا۔ باعتبار نتیجہ ان کو نفرت اور تشدد کے کلچر میں مبتلا کرنا۔

دورِ جدید نے جو مواقع پیدا کیے ہیں، اس کا ذکر کرنے کے بجائے حالت زار کا ذکر کرنا سادہ واقعہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنما دور جدید کو دورِ ظلم کے طور پر جانتے تھے، وہ اس دور کو دورِ ترقی کے طور پر نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حالت زار کو جانا، اور وہ ترقی کے مواقع سے بے خبر رہ گئے۔

اصل یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ملت مسلمہ کے ساتھ دو المیے پیش آئے۔ ان دونوں المیوں نے ملت مسلمہ کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا، اس کی نظیر شاید ملت کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلم لیڈروں نے ملت کو یہ نقصان پہنچایا کہ موجودہ زمانہ مواقع کے انفجار کا تھا۔ مگر عین اسی وقت انھوں نے امت کو قابلِ حصول گول سے ہٹا کر اس گول کی طرف لگا دیا، جو کبھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

یہ طریقہ پیغمبر اسلام ﷺ کے نمونے کے سراسر خلاف تھا۔ آپ نے 610ء میں قدیم مکہ میں اپنا مشن شروع کیا۔ آپ کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کا جواب آپ کے عمل کے نتیجہ میں ملتا ہے۔ خالد بن ولید جب اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ جا رہے تھے، تو راستے میں ان کی ملاقات عمرو بن العاص سے ہوئی۔ اس وقت خالد بن الولید نے عمرو بن العاص سے کہا: دَخَلَ النَّاسُ فِي الإِسْلامِ فَلَمْ يَبْقَ أَحَدٌ بِهِ طُعْمٌ (البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد 4، صفحہ 271)۔ یعنی، لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، اور کوئی بھی صاحب ذوق آدمی باقی نہیں رہا۔

یہاں رجل ذو طعم (صاحب ذوق انسان) سے مراد ہے صاحب فکر انسان۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ مکہ کے تمام صاحب فکر انسان رسول اللہ ﷺ کے ساتھی بن گئے۔ پیغمبر اسلام نے عرب کے منفی حالات پر دھیان دینے کے بجائے وہاں موجود مواقع کو اویل کیا۔ یعنی آپ نے خدائی منصوبۂ تخلیق کی روشنی میں انسان کی شخصیت کی تعمیر کا کام کیا۔ اس وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ اہل عرب کے تمام اصحابِ فکر رسول اللہ کے ساتھی بن جائیں۔

تخلیقیت

موجودہ دنیا مختلف قسم کے اسباب اور احوال سے بھری ہوئی ہے۔ یہ اسباب اور احوال ہم سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں اور آپ اپنے زور پر قائم ہیں۔ ہم ان سے ہم آہنگی کر کے اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں، ان کو نظر انداز کرکے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اس صورت حال کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیش آمدہ حالات کے اعتبار سے پورے معاملہ پر ازسرِ نو غور کرسکے۔ وہ مسئلہ کا نیا حل دریافت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی معنی میں ایک فرانسیسی مفکر اِمیل شارتییہ (Emile Chartier, 1868-1951) نے کہا ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک نہیں کہ آدمی اپنے پاس صرف ایک ہی تصور رکھتا ہو:

> Nothing is more dangerous than an idea when it is the only one we have.

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کے حل کے لیے ہماری ابتدائی تدبیر غیر موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ہم اپنی سابقہ سوچ کے دائرہ سے نکل کر کوئی نئی تدبیر اختیار کر سکیں۔ اسی صلاحیت کا نام تخلیقیت (creativity) ہے۔ اور اسی تخلیقی صلاحیت میں آدمی کی کامیابی کا راز چھپا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ غزوۂ بدر (2 ہجری) کے موقع پر آپ دشمنوں سے لڑے۔ مگر غزوۂ احزاب (5 ہجری) کے موقع پر آپ نے اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کی رکاوٹ قائم کردی۔ غزوۂ احد (3 ہجری) میں آپ نے اپنے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی اور حدیبیہ (6 ہجری) کے موقع پر جنگ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ غزوۂ حمراء الاسد (3 ہجری) میں آپ نے اعلان واظہار کے ساتھ مارچ کیا، مگر برعکس طور پر فتح مکہ (8 ہجری) کے سفر میں مکمل خاموشی کا طریقہ اختیار فرمایا، وغیرہ۔ (الرسالہ، جون 1987)

کامیاب عمل کا راز

کامیاب عمل کا راز کیا ہے۔ حالات کو پڑھ کر اپنے لیے نقشہ بنانا۔ اس کے لحاظ سے کام کرنا، یعنی کامیابی نام ہے ممکن مواقع کو اپنے لیے اویل کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ جب آپ مکہ میں رہے، تو مکہ کے لحاظ سے کام کیا، اور مدینہ گئے تو مدینہ کے لحاظ سے کام کیا۔

مثلاً آپ نے مکہ میں تیرہ سال تک مشن کا کام کیا۔ مگر آپ نے مکے میں بتوں کو نہیں توڑا، اور نہ ہی ان بتوں کے خلاف کوئی بیان بازی کی۔ اس کے برعکس، آپ نے یہ کیا کہ بتوں کی زیارت کے لیے آنے والے آڈینس (audience) کو اپنا پیغام پہنچایا۔ یعنی آپ کو یہ سمجھ میں آیا کہ مکہ میں کام کے بہت مواقع ہیں، لیکن بتوں کو توڑنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے آپ نے کعبہ میں بتوں کی موجودگی سے وقتی طور پر اعراض کیا اور مکہ کے باہر سے بتوں کی زیارت کے لیے آنے والے عربوں کو اپنے آڈینس کے طور پر دیکھا، اور انھیں مکمل خیر خواہی کے ساتھ خدا کا پیغام پہنچایا۔ یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب ثابت ہوا۔

اس کے برعکس، موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر بہت سی تحریکیں چلائی گئیں، مسلم رہنماؤں نے اسلام کے احیا کے لیے بہت زیادہ کوششیں کیں۔ ان کے پاس مسلمانوں کی بڑی بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ مگر ان کی کوششیں کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوئیں۔ ان کی قربانیوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس معاملے میں ہماری تاریخ یہ ہے — جان و مال کی قربانیوں کا ڈھیر، مگر نتیجہ کے اعتبار سے صفر (zero) کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسلام کی پوری تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ قربانی کی حد تک عالمی کوششوں کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے کامیابی کا مجرب فارمولا چھوڑ دیا، اس لیے ان کی کوششیں بھٹکاؤ کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ وہ مجرب فارمولا جگر مرادآبادی (1890-1960) کے الفاظ میں یہ تھا:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں　　　اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جدید اسلامی لٹریچر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، سب ان کی قوموں کی زبان میں بھیجے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (14:4)۔ اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ انسانوں کو اللہ رب العالمین کے منصوبۂ تخلیق سے آگاہ کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ یہ آگاہی ہر فرد کی اپنی زبان اور قابل فہم انداز میں دی جائے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس طرح دوسری چیزوں میں انقلاب آیا ہے اسی طرح زبان وادب میں بھی زبردست انقلاب آیا ہے۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں بالکل ایک نیا انداز بیان وجود میں آیا ہے۔ آج کا انسان اسی بات کو اہمیت دیتا ہے جو جدید سائنسی اسلوب میں ڈھال کر اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اور جو چیز سائنسی اسلوب میں ڈھلی ہوئی نہ ہو وہ جدید انسان کو اپیل نہیں کرتی، وہ اس کے دل ودماغ میں اپنی جگہ نہیں بناتی۔

اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ موجودہ زمانہ میں جدید اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ جو وقت کے علمی اور ادبی اسلوب کے مطابق ہو۔ اس کی اہمیت غیر مسلم قوموں کے لیے بھی تھی اور خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی۔ مگر یہاں دوبارہ مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات رکاوٹ بن گئی۔ جدید علمی انداز یا نیا ادبی اسلوب پیدا کرنے والی قومیں عین وہی تھیں، جن سے ہمارے مسلم رہنما نفرت میں مبتلا تھے۔ اور جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توجہ اور دل جمعی کے ساتھ جدید اسلوب کو سمجھنے کی کوشش نہ کر سکے۔ نتیجتاً وہ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنے میں بھی ناکام رہے۔

دور جدید میں اسلام کے احیا اور تجدید کے کام کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ بنیادی ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا شعور تک موجود نہیں۔ میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو ایک مشہور حلقہ

سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمان ابھی تک یہ نہ کر سکے کہ وہ وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ انھوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ کام انجام دے دیا ہے۔ ان کی کتابیں وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مذکورہ شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے چند سطریں صرف لکھوا کر بھیج دیجیے کہ وقت کا فکری مستویٰ کیا ہے اور اس سے مراد کیا ہے۔ مگر آج تک ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا، جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایسے لٹریچر کا وجود نہیں۔

1980 میں میری ملاقات امریکا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص مسٹر اسٹیو اسکلر (Steve Sklar) سے ہوئی۔ وہ فلوریڈا کے ایک عیسائی خاندان میں 1947 میں پیدا ہوئے۔ ان کو تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا، اور انھوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے ان مسلم مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں، جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ کتابیں میرے نزدیک بالکل کوڑا (rubbish) ہیں۔ مغربی ملکوں میں ان کے ذریعہ سے اسلام کے تعارف کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ یہ انگریزی ترجمے زبان کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کی زبان جاندار زبان نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے بھی ان کتابوں میں ایسی کمیاں ہیں کہ وہ مغربی انسان پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے چند باتیں بتائیں۔ انھوں

نے کہا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا مغرب کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا ہے۔ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہندو مفکرین کی کتابوں میں اپنے مخاطب کے لیے محبت کا جذبہ ملتا ہے، مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کی کتابوں میں کم از کم مغربی مخاطب کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ ان کتابوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں غلط قسم کی تعمیم (generalisation) پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی سوسائٹی سے کوئی منفرد اور استثنائی واقعہ لیں گے اور اس کو اس طرح بیان کریں گے گویا کہ یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت ہے۔ مثلاً ایک مسلم مصنف نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک مغربی خاتون کے گھر پر اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اس وقت مغربی خاتون غسل خانہ میں نہا رہی تھی۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر بالکل ننگی باہر نکل آئی۔ اس قسم کا واقعہ کوئی استثنائی واقعہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت نہیں۔ ان مصنفین کا حال یہ ہے کہ وہ مغربی سوسائٹی کا کوئی برا واقعہ لیں گے، اور اس کو مغربی سوسائٹی کی عام حالت بتائیں گے۔ دوسری طرف یہی لوگ اسلام کے بارے میں یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا ایک نہایت اچھا واقعہ منتخب کرتے ہیں اور اس کو اسلامی سوسائٹی کی عام حالت بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تقابل علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

اسی طرح ان کتابوں میں ایک عام کمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے وہ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کریں گے اور مغرب کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی مثال دیں گے۔ حالاں کہ یہ تقابل سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہیے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کریں۔ مثلاً پیغمبر کے حجۃ الوداع کی تقریر کا تقابل انھیں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر سے کرنا چاہیے، نہ کہ ساؤتھ افریقہ کی عملی صورت حال سے، وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر اسٹیو اسکلر کی مذکورہ نشاندہی بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید قومیں ہمارے مسلم رہنماؤں کے لیے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئیں۔ یہ ذہن اتنا عام ہوا کہ مسلمانوں کی غیر سیاسی شخصیتیں بھی اس نفسیات سے محفوظ نہیں رہیں۔ اس کی ایک عبرت ناک مثال وہ ہے جس کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی (1908-1985) نے نقل کیا ہے۔

مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری (1874-1948) نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب ''اصح السیر'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چوں کہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں ردّ و بدل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے۔ اصح السیر میں یہ بات پڑھ کر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی طرف رجوع کیا، جن کی نظر مخطوطات پر بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ مولانا اعظمی نے جواب میں تحریر فرمایا کہ طبقات ابن سعد کا ایڈیشن جس مخطوطہ پر مبنی ہے، اس کو میں نے دیکھا اور مطبوعہ ایڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے۔ (ماہنامہ برہان، دہلی، جون 1982)

اس نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ جدید اسلوب یا جدید معیار ادب کو سمجھیں، جن کو پیدا کرنے والی خود یہی مغربی قومیں تھیں۔ جدید قوموں سے نفرت مسلمانوں کے لیے اس میں مانع ہوگئی کہ وہ جدید اسلوب کو سمجھیں، اور اس میں مہارت پیدا کرکے لسانِ قوم میں اسلامی لٹریچر فراہم کریں۔ (الرسالہ، جولائی 1987)

ہمارا مشن

ہمارا مشن ہے گلوبل انفراسٹکچر کو اویل کر کے تمام انسانوں تک خدائی پیغام پہنچانا۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہمارے دل میں کسی کے خلاف شکایت نہیں ہے۔ اگر آپ کا دل شکایت سے خالی ہو تو آپ گلوبل آؤٹ سورسنگ کے چیمپین بن جاتے ہیں۔

منفی ذہن کا قاتل

ایک مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے۔ اور اس پر غور کرتا ہے، یا جب وہ سفر کرتا ہے۔ اور سفر کے دوران وہ معرفت کا رزق حاصل کرتا ہے۔ اور اس طرح کے دوسرے افعال جو وہ صبح شام کرتا ہے، یہ سب کچھ اُس انفراسٹرکچر کی مدد سے ہوتا ہے جو جدید ٹکنالوجی کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ جدید انفراسٹرکچر کس نے تیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب زیادہ تر غیر اہلِ ایمان نے تیار کیا ہے۔ یہ لوگ مادی ترقی کے میدان میں مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک مومن کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس انفراسٹرکچر کو استعمال کرکے اپنے دینی ارتقا کا سامان کرسکے۔

گویا یہ لوگ اہلِ ایمان کو مادی ترقی کی جدوجہد سے بے نیاز کیے ہوئے ہیں۔ وہ خاموش زبان میں یہ کہہ رہے ہیں کہ تم اپنا دینی کام کرو، ہم تمہارے حصے کا مادی کام انجام دیتے رہیں گے۔ ایسا کرتے ہوئے اگر وہ کچھ مالی یا سیاسی فائدہ حاصل کررہے ہیں، تو گویا وہ ان کے عمل کے لیے محرک (incentive) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ محرک موجود نہ ہوتو وہ ہماری مادی تائید کا کام بھی انجام نہ دیں۔

تائید کا یہ معاملہ ہر انسان کے ساتھ ہر سطح پر پیش آرہا ہے۔ ہر ایک کی زندگی میں دوسرے لوگ بڑے پیمانے پر کنٹری بیوشن (contribution) دے رہے ہیں— ہوم کنٹری بیوشن، سوشل کنٹری بیوشن، نیشنل کنٹری بیوشن، انٹرنیشنل کنٹری بیوشن، سویلائزیشن کنٹری بیوشن۔ کنٹری بیوشن کا یہ کام زیادہ تر مادہ پرست لوگ انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ دین کو فارغ کررہے ہیں کہ وہ پوری طرح یکسو ہوکر اپنے دینی امور کو انجام دیتے رہیں۔

اہل دین کو اگر اس حقیقت کا زندہ شعور حاصل ہوجائے تو ان کے منفی ذہن کا کلّی خاتمہ ہوجائے۔ ان کو معلوم ہوجائے کہ وہ بالواسطہ طور پر ہماری بہت بڑی تائید کررہے ہیں۔ انہوں نے ہم کو فارغ کررکھا ہے کہ ہم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے دینی کام کو انجام دیتے رہیں۔ اس کے بعد اہل دین کے اندر منفی ذہن کا خاتمہ ہوجائے۔ وہ نفرت کے بجائے ان سے محبت کرنے لگیں۔

مشن کلچر، خواہش کلچر

ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ایک معاملے میں آپ سے مشورہ کرنا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے کئی بچے ہیں۔ میں نے اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کی، تا کہ وہ میرے کہنے میں رہیں۔ مگر اب حال یہ ہے کہ بچے میری بات نہیں سنتے، لڑکیوں کا بھی یہی حال ہے۔ اورلڑکوں کا بھی یہی حال ہے۔

اس معاملے کو میں نے اس وقت سمجھا جب کہ مجھے ایک تقابل کا موقع ملا۔ ایک اور مسلمان ہیں۔ وہ اپنے معاشی کام کے علاوہ الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ وہ اپنے گھر کے تمام افراد کو الرسالہ پڑھاتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر اور گھر کے باہر صرف الرسالہ مشن کا چرچا کرتے ہیں۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک قابل لحاظ حصہ الرسالہ اور الرسالہ مطبوعات کی اشاعت میں لگاتے ہیں۔ ان کے بھی کئی بچے ہیں۔ لیکن سب بچے صالح ہیں۔ اور جائز طور پر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اس تقابل میں دیکھیے تو پہلے گھر میں خواہش کلچر رائج ہوا، اور دوسرے گھر میں مشن کلچر رائج ہوا۔ اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ پہلے گھر کے بچے بگڑ گئے اور دوسرے گھر کے بچے بگڑنے سے بچ گئے۔ انہیں دونوں واقعات میں تمام گھروں کی کہانی چھپی ہوئی ہے، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔

جس گھر میں خواہش کلچر چلے، وہاں اصول کلچر نہیں چل سکتا۔ ایسے گھر میں لوگ اپنی اپنی خواہش پر چلنے لگیں گے، نہ کہ کسی اعلی اصول پر۔ اس کے برعکس، جس گھر میں مشن کلچر چلایا جائے، وہاں لوگوں کی سوچ کا رخ بدل جائے گا۔ مشن کا مزاج لوگوں کے اندر سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرے گا۔ ان کے ذہن میں کامیابی اور ناکامی کا معیار مشن کی نسبت سے متعین ہوگا۔ وہ اپنی زندگی کو خدائی احکام اور اخلاقی ڈسپلن کا پابند بنائیں گے، نہ کہ اس سے آزاد۔

ظلم کے خلاف مزاحمت

قرآن میں زندگی کی ایک حقیقت کو تکرار کے ساتھ دو آیتوں میں بیان کیا گیا ہے: فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (94:5-6)۔ یعنی، پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عسر اور یسر دونوں اس دنیا میں لازم وملزوم ہیں، یعنی یسر کا دامن عسر کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے ایک لفظ کا بہت استعمال کرتے ہیں، وہ ہے ظلم کے خلاف مزاحمت۔ یہ لفظ کسی نہ کسی طور پر لمبی مدت سے دہرایا جا رہا ہے۔ لیکن حاصل کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ ظلم کے خلاف مسلمانوں کی شکایتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جس چیز کو ظلم کہا جاتا ہے، وہ عسر کا حصہ ہے۔ اس کے خلاف جو چیز تلاش کرنے کی ضرورت ہے، وہ یسر، یعنی مواقع اور پازیٹیو پوائنٹ کو تلاش کرنا۔ یعنی عسر میں جو یسر چھپا ہوا ہے، اس کو تلاش کیا جائے، نہ کہ ظلم کے خلاف ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنا۔ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے کہ اس دنیا سے ظلم یا عسر کبھی ختم ہو۔

یہی موجودہ دنیا کے لیے اللہ کا قانون ہے۔ یہاں ابتداءً انسان کے ساتھ عسر کے حالات پیش آتے ہیں۔ لیکن اگر وہ صبر کے ساتھ عسر میں یسر کو تلاش کرے، تو اس کے لیے یُسر نیا راستہ کھول دیتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف دیکھے، وہ اپنی استطاعت کے بقدر اپنے مثبت ذہن کے ساتھ عسر میں یسر کو دریافت کرنے کی کوشش کرے۔

آدمی جب ظلم کے خلاف مزاحمت کرتا ہے، تو اس کو کیا ملتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو صرف نفرت اور تشدد اور منفی سوچ جیسی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تعمیری قوت کو کم کرکے قوتِ غضب کو بڑھا لیتا ہے۔ اس کے برعکس، آدمی جب مواقع کو تلاش کرے، تو اس کو کیا ملتا ہے۔ مواقع کو دریافت کرنے کے ذہن سے سوچے تو اس کے اندر مثبت سوچ جاگتی ہے۔ وہ ناکامی کے بعد اپنا احتساب کرکے کامیابی کو تلاش کرتا ہے، وہ دوسروں کے خلاف چیخ وپکار کرنے کے بجائے

خود اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات کو ڈھونڈتا ہے، اس طرح آدمی کے اندر ایک مثبت سوچ جاگتی ہے۔ جو آخر کار اس کو کامیابی تک پہنچا دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ حالات زار یا ناموافق حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حالات ہمارے لیے موافق نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (90:4)۔ یعنی، ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات (hardship) انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ وہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ اسی وجہ سے انسان کسی حال میں اپنے آپ کو مشقتوں سے آزاد نہیں کر پاتا ہے۔ ایسی حالت میں مشکلات کے حوالے سے سوچنا بجائے خود درست نہیں۔

انسان کو کبد (عسر) کے اندر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کبد زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ کبد کو لے کر اپنی زندگی کا منصوبہ نہ بنائے، بلکہ کبد کے اندر جو موافق حالات موجود ہیں، ان کو لے کر اپنی زندگی کی پلاننگ کرے۔ انسان کا منصوبہ مبنی بر غیر موافق حالات نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مبنی بر موافق حالات ہونا چاہیے۔ یعنی غیر موافق پہلوؤں کے درمیان موافق پہلوؤں کو دریافت کرنا۔

بے مسئلہ انسان

جب آدمی سوسائٹی میں رہتا ہے تو اس کے لیے صحیح یہ ہے کہ وہ بے مسئلہ انسان بن کر رہے۔ بے مسئلہ انسان (no problem person) بننے کا اصول یہ ہے کہ آدمی کے اندر قابلِ پیشین گوئی کردار (predictable character) موجود ہو۔ یعنی دوسرا آدمی یہ جانے کہ اس کا سلوک آپ کے ساتھ کیا ہوگا۔ مثلاً آپ کسی دکان دار سے کوئی چیز خرید رہے ہیں تو دونوں فریق پہلے سے یہ جانتے ہوں کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہوگا۔ اسی طرح کسی معاملے میں آدمی کا ردّعمل کیا ہوگا، اگر یہ بات پہلے سے معلوم ہو تو ہر فریق اپنا جوابی ردّعمل بھی پہلے سے طے کرسکتا ہے، اور غیر ضروری ردّعمل سے بچتے ہوئے اپنا کام انجام دے سکتا ہے۔

رائٹ ٹریک

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ انسان کو ابتلا کے لیے مصیبتوں میں ڈالتا ہے (البقرۃ، 2:155)۔ ابتلا کا مطلب، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مصیبت نہیں ہے، بلکہ اصلاح کے لیے شاک ٹریٹمنٹ ہے (الاعراف، 7:168)۔ انسان جب رائٹ ٹریک سے ہٹ جاتا ہے، تو خدا اس کو شاک پہنچاتا ہے تاکہ وہ دوبارہ رائٹ ٹریک پر آجائے۔ یہ طریقہ دیندار لوگوں کے لیے بھی ہے، اور سیکولر لوگوں کے لیے بھی۔ اور یہ طریقہ پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے سبق لیا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانے میں مسلم لیڈروں کو اپنے پولیٹیکل پلان میں ناکامی ہوئی۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ تھا تاکہ مسلمان لیڈر جانیں کہ ان کی گاڑی رائٹ ٹریک سے ہٹ گئی ہے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ ہمارے لیڈروں نے یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کردیا کہ ہمارے دشمنوں کی سازش ہے۔ تقریباً تمام مسلم لیڈروں نے یہی غلطی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی رہنما نے اپنے ٹریک کو بدلا نہیں، اور بدستور اپنے اختیار کردہ ٹریک پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ناکامی کی تاریخ بنا کر اس دنیا سے چلے گئے۔ یہی تقریباً تمام رہنماؤں کا حال ہوا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ مسلم رہنما اپنی اس روش کو بدلیں۔ وہ سازش کی زبان بولنا بند کریں، اور ہر بار جب ان کو کسی ناکامی کا سابقہ پیش آئے تو اس کو وہ خدا کی طرف سے اس بات کا اشارہ سمجھیں کہ اپنی گاڑی کو دوبارہ رائٹ ٹریک پر لاؤ، تاکہ تمھارا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔ مثلاً جمال الدین افغانی، محمد علی جناح، سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ نے ملت کی گاڑی کو سیاست کے راستے پر چلا دیا تھا۔ مگر ان کو اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکامی ہوئی۔ مگر انھوں نے اور ان کے پیروؤں نے یہ اعلان کردیا کہ یہ دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہر ناکامی فطرت کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ تم راستہ بھٹک گئے ہو، اپنے آپ کو دوبارہ رائٹ ٹریک پر لے آؤ۔

تشکیل حیات

ایک مبصر نے جدید سائنسی تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے اندر فکری استحکام (ideological permanence) نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بطلیموس کی جگہ کوپرنیکس ظاہر ہوا۔ پھر کوپرنیکس کی جگہ نیوٹن نے لے لی۔ اس کے بعد نیوٹن کی جگہ آئن اسٹائن آگیا:

Copernicus replaced Ptolemy, Newton replaced Copernicus, and Einstein replaced Newton.

موجودہ دور کے کلچر کو کلچر آف ٹکنالوجی کہا جاتا ہے، مگر یہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ کلچر اپنی ذات میں دوامیت (permanence) چاہتا ہے۔ مگر سائنس یا ٹکنالوجی دوامی صفت سے خالی ہیں۔ ایسی حالت میں ٹکنالوجی کی بنیاد پر بننے والا کلچر ہمیشہ غیر مستحکم (impermanence) رہے گا۔ وہ انسانی فطرت کے ابدی تقاضے کو پورا نہیں کرسکتا۔ ٹکنالوجی انسان کی خادم ہے، وہ انسانی کلچر کی بنیاد نہیں۔ ٹکنالوجی صرف یہ کرسکتی ہے کہ وہ زراعت کو ہل کے دور سے نکال کر ٹریکٹر کے دور میں پہنچا دے، یا سفر کو بیل گاڑی کے دور سے آگے بڑھا کر ہوائی جہاز کے دور میں داخل کردے۔ لیکن ٹکنالوجی حقیقی معنوں میں انسان کو کلچر یا تہذیب نہیں دے سکتی۔ ٹکنالوجی انسان کی خادم بن سکتی ہے، مگر اس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ انسان کو مذہب حیات فراہم کرنے کا کام انجام دے گی۔

ٹکنالوجی، ایک لفظ میں، خادم حیات ہے اور کلچر مذہب حیات۔ ٹکنالوجی اگر زندگی کی سواری ہے تو کلچر انسان کی منزل متعین کرنے والا ہے۔ سواری جیسی چیزوں کے معاملہ میں تبدیلی سے کوئی حقیقی نقصان نہیں۔ لیکن اگر کلچر کی بنیادوں میں تبدیلی کی جانے لگے تو پوری انسانی زندگی اپنی معنویت کھودے گی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹکنالوجی کو زندگی کا خدمت گزار بنایا جائے۔ اور مذہب کو کلچر کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے۔ پھر جب یہ دیکھا جائے کہ تمام مذاہب میں محفوظ اور ثابت شدہ مذہب صرف اسلام ہے تو یہ بات بھی طے ہوجاتی ہے کہ کلچر کے اعتبار سے زندگی کی تشکیل کے لیے واحد بنیاد صرف اسلام ہے۔ اسلام انسانی زندگی کی تشکیل کے لیے ایسی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ (الرسالہ، جولائی 1992)

اسلامی مسلک

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (4:1)۔ مفسر ابن کثیر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیدائش کی اصل ایک باپ اور ایک ماں سے ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کی طرف مائل ہوں: أَنَّ أَصْلَ الْخَلْقِ مِنْ أَبٍ وَاحِدٍ وَأُمٍّ وَاحِدَةٍ لِيَعْطِفَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 488)۔

حدیث میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ تمام انسان یکساں طور پر اللہ کے بندے ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں: أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ (مسند احمد، حدیث نمبر 19293)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے: كُلُّكُمْ بَنُو آدَمَ، وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ (مسند البزار، حدیث نمبر 2938)۔ اس اسلامی اصول کے مطابق، مسلمان اور غیر مسلم سب ایک دوسرے کے لیے بھائی بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی صحیح ترین صورت یہ ہے کہ اس کو برادرانہ بنیاد پر استوار کیا جائے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کو "متحدہ قومیت" سے تعبیر کیا تھا (ملاحظہ ہو مولانا موصوف کی کتاب، متحدہ قومیت اور اسلام، مطبوعہ 1938، مجلس قاسم العلوم دیوبند)۔ مولانا حسین احمد مدنی کے ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ نظر کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو، مکتوبات شیخ الاسلام، جلد 1، مکتوب 65، معارف، 1952۔

1947 سے پہلے ہندستان کے تقریباً تمام علما اس مسلک پر متفق تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی بھائی کی طرح متحد کرنا چاہتے تھے۔ مگر بعض ناموافق اسباب کی بنا پر، قومی اتحاد کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کے برعکس، دونوں فرقوں کا تعلق، تقسیم اور علاحدگی پسندی کی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ اس تفریقی سیاست کے نہایت مہلک نتائج برآمد ہوئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ سیاست کا طوفان ختم ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے دسمبر 1947 میں لکھنؤ میں ایک مسلم کانفرنس کی۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے

ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہوسکتی کہ فرقہ واریت کو جو مذہب کے نام پر ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کردیا جائے۔ اگر ہمیں بربادی سے بچنا ہے تو فرقہ پرستی کے تمام دروازوں کو ہمیں بند کرنا پڑے گا۔ اور ہندو مسلم تعلق کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ علما کے اس مسلک کو جو مکمل طور پر قرآن وسنت پر مبنی تھا، اس کو دوبارہ پوری طاقت کے ساتھ زندہ کیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے بلاشبہ صحیح اور مفید پالیسی یہی ہے کہ اس ملک میں دونوں فرقوں کے تعلق کو اخوت اور اتحاد کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔

الرسالہ مشن پچھلے 20 سال سے یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس مشن کو علمائے اسلام کی تائید حاصل ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس اصلاحی مہم کو مزید موثر اور کامیاب بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں چند بنیادی نکات حسب ذیل ہیں:

1۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ ان کے باہمی تعلق کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے کہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا میں برادرانہ اختلاط ہونے لگے۔

2۔ مسلمان احتجاج غیر کے بجائے تعمیر ذات کو اپنی مستقل پالیسی بنائیں۔ وہ احتجاج اور مظاہرہ اور جلوس کے طریقہ کو یکسر چھوڑ دیں۔ شکایت کے مواقع پر وہ ٹکراؤ سے بچیں اور ہمیشہ پر امن تدبیر کے ذریعہ نزاعی معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں۔ نزاع کے موقع پر ٹکراؤ کا طریقہ نزاع کو بڑھاتا ہے اور مفاہمت کا طریقہ نزاع کو ختم کر دیتا ہے۔

3۔ تعلیم اور اقتصادیات کو سب سے زیادہ قابل توجہ چیز قرار دیا جائے۔ مسلمانوں میں تعلیم اگر عام ہو اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہوجائے تو اس کے بعد تمام مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔

4۔ ہر مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ امن کمیٹیاں بنائی جائیں۔ اس کے ذریعہ یہ کوشش ہو کہ امن اور اتحاد کو برہم کرنے والے ہر واقعہ کو ابتدا ہی میں حسنِ تدبیر سے ختم کر دیا جائے۔

5۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھیں۔ رایوں کے فرق کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کریں۔ (مطالعہ حدیث، صفحہ 264-263)

معاش کا مسئلہ

آج کل اکثر لوگ معاشی مسائل کی بات کرتے ہیں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مسئلے کی بات نہیں ہے، بلکہ خود زمانے سے بے خبری کی بات ہے۔ موجودہ زمانہ انفجارِ روزگار (explosion of job) کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں کام کی اتنی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ آدمی واقعی طور پر روزگار چاہے، اور اس کو روزگار نہ ملے۔ قدیم زمانہ زراعت کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں صرف کھیت کے کچھ کام ہوا کرتے تھے۔ اب صنعت (industry) اور سروس کا زمانہ ہے۔ اس طرح موجودہ زمانے میں بے شمار نئے کام پیدا ہوگئے ہیں۔ اس زمانے میں بے روزگاری کی شکایت کرنے والے عام طور پر وہ لوگ ہوتے، جو کہتے ہیں کہ میں صرف اسی کام کو انجام دوں گا جو میرے طے کیے ہوئے معیار کے مطابق ہو، اور جو میرے معیار کے مطابق نہ ہو، میں اس کو انجام نہیں دوں گا۔ مگر یہ ایک قسم کا انیکرونزم (anachronism) ہے۔

قدیم زمانے میں تعلیم ایک بے حد محدود دائرے کا نام تھی۔ اب تعلیم ہزاروں قسم کے نئے شعبوں کا نام بن گئی ہے۔ قدیم زمانے میں ہنر اور مزدوری میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا تھا۔ موجودہ زمانے میں ہنر ایک مستقل ذریعہ معاش بن گیا ہے۔ بے شمار قسم کے نئے نئے ہنر پیدا ہوگئے ہیں، اور ان کو سیکھ کر اکثر لوگ ان سے بھی زیادہ کمائی کر رہے ہیں، جتنا کہ ڈگری والے کمائی کرتے ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں بہت سے ایسے نوجوان ہیں، جو غریب گھروں میں پیدا ہوئے، ان کے ماں باپ کے پاس تعلیم کی فیس ادا کرنے کی رقم موجود نہ تھی۔ ایسی نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے کام پکڑ لیے، اور غربت کے باوجود اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ مثلاً کوئی نوجوان گھر گھر اخبار پہنچانے لگا، کسی نوجوان نے ہر گھر انڈا اور چائے اور شکر جیسی چیزیں پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی پڑھائی کو جاری رکھا، یہاں تک کہ کچھ سالوں کے بعد ڈگری والی تعلیم حاصل کرلی، اور اب وہ کسی آفس میں جاب حاصل کرکے سماج میں باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔

ریزرویشن کا طریقہ

ایک مرتبہ مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ اس میں نہایت دھوم کے ساتھ ریزرویشن کے اصول کی وکالت کی جارہی تھی۔ یعنی تعلیم اور ملازمت میں مسلمانوں کو ان کے عددی تناسب کے اعتبار سے محفوظ سیٹوں کا دیا جانا۔ کہنے والے کہہ رہے تھے کہ مسلمان اس ملک میں ترقی میں پچھڑ گئے ہیں، ان کو ترقی کی دوڑ میں شامل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو ریزرویشن دیا جائے، ریزرویشن کے بغیر وہ آگے بڑھنے میں ناکام رہیں گے۔ ایک صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ تیس سال تک دوسروں کو مواقع دینے کا طریقہ بند کر دیا جائے، اور صرف مسلمانوں کو موقع دیا جائے۔ یہ طریقہ اس وقت تک جاری رہے، جب تک مسلمان دوسری کمیونٹی کے برابر نہ ہوجائے۔

یہ سوچ انتہائی حد تک غیر عملی ہے۔ آپ سڑک کی سیاست خواہ کتنی ہی زیادہ چلائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ نام نہاد پسماندہ طبقوں کو ریزرویشن دے کر ترقی کے راستے پر لگا دیا جائے۔ یہ اصول کہنے کے اعتبار سے خواہ کیسا ہی ہو، لیکن ترقی کے اعتبار سے وہ سراسر ناقابلِ عمل اصول ہے۔ ریزرویشن کے ذریعے ترقی پانا ایسا ہی ہے، جیسے ترقی پانے کے لیے خوش خیالی (falsehood) میں جینا۔

ریزرویشن نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیچھے ہونے والوں کو ہمیشہ کے لیے پیچھے کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ پچھڑ گئے ہیں، ان کو دوسرا چانس دینا۔ یعنی ان کو یہ موقع دینا کہ وہ مزید محنت کر کے دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب افراد کی فہرست میں شامل کریں، اور اس طرح ترقی کے میدان میں اپنا سفر جاری رکھیں۔

اگر آپ ترقی کی دوڑ میں پہلی بار آگے نہ آسکے، تو آپ کے لیے دوسرا موقع (second chance) اب بھی موجود ہے۔ آپ رعایت کے غیر عملی مطالبے میں وقت ضائع نہ کریں، بلکہ دوبارہ محنت کر کے سیکنڈ چانس کو اویل کریں۔ آپ کے لیے یہی واحد قابلِ عمل صورت ہے۔ دوسری کوئی صورت سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ زندگی کا اصول ہے — ناممکن کو چھوڑ کر ممکن کے پیچھے دوڑنا۔

امتیازی سلوک

ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک بڑی کمپنی میں سروس کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری کمپنی میں امتیاز (discrimination) کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہماری کمپنی کا باس (boss) ایک کمیونل ذہن (communal mind) کا آدمی ہے۔ مثلاً اس نے میرے ایک ساتھی (colleague) کا پروموشن کردیا اور میرا پروموشن ابھی تک نہیں کیا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ امتیازی سلوک (discrimination) سمجھ رہے ہیں، وہ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اصل یہ ہے کہ امتیازی سلوک کا وجود خارج میں نہیں ہوتا، وہ آپ کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ آپ کی اپنی سوچ ہے کہ ایک واقعہ جو فطری اسباب کے تحت پیش آیا ہو، اس کو آپ اپنے حق میں امتیاز سمجھ لیتے ہیں۔ آپ کا یہ احساس صرف اس لیے ہوتا ہے کہ آپ اس دریافت میں ناکام رہے کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا۔

میں نے کہا کہ جو واقعہ پیش آیا وہ تو لازماً پیش آئے گا۔ اس کے پیش آنے کو آپ روک نہیں سکتے۔ مگر ایک چیز آپ کے اختیار میں ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنے آپ کو کمتری کے احساس سے بچائیں۔ پیش آنے والے واقعے کو اگر آپ اسباب کا نتیجہ سمجھیں تو اس کے پیش آنے کے باوجود آپ نارمل بنے رہیں گے۔ آپ کا اپنا ذہنی سکون بدستور باقی رہے گا۔ اس کے برعکس، اگر آپ پیش آنے والے واقعے کو امتیازی سلوک کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کا احساس یہ ہو جائے گا کہ مجھے حقیر سمجھا گیا۔

جو واقعہ پیش آیا اس میں آپ کا کوئی دخل نہ تھا، لیکن آپ کا احساسِ کمتری خود آپ کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ دوسرے کے اوپر آپ کا بس نہیں۔ لیکن آپ کی اپنی ذات پوری طرح آپ کے قبضے میں ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا فارمولا صرف ایک ہے — اپنے آپ کو اپنے آپ سے بچائیں:

Save yourself from yourself.

وقت اور سمجھ

ایک دانشمند کا قول ہے — وقت اور سمجھ دونوں اکثر ساتھ ساتھ نہیں آتے۔ جب وقت آتا ہے تو سمجھ نہیں ہوتی اور جب سمجھ آتی ہے تو وقت نکل چکا ہوتا ہے۔

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ اس کا تعلق افراد سے بھی ہے اور قوموں سے بھی۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو افراد کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ اور قوم کے ساتھ بھی۔

یہی اس دنیا میں کسی بڑی کامیابی کی سب سے بڑی شرط ہے۔ جو لوگ شعوری اعتبار سے اتنا زیادہ بیدار ہوں کہ جب کوئی موقع (opportunity) آئے تو فوراً وہ اس کو پہچان لیں اور حکمت کے ساتھ اس کو استعمال کریں، تو ایسے ہی لوگ اس دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، جن لوگوں کا شعور اس طرح بیدار نہ ہو، ان کا حال یہ ہوگا کہ مواقع ان کے سامنے آئیں گے، لیکن وہ ان کو استعمال نہ کرسکیں گے۔ وہ مواقع کو صرف اس وقت پہچانیں گے جب کہ ان کا وقت گزر چکا ہو۔

مثال کے طور پر اجتماعی زندگی میں کامیابی کے لیے انٹرایکشن (interaction) کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ انٹرایکشن کے ذریعے تعلقات بنتے ہیں اور پھر یہی تعلقات ترقی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں انٹرایکشن کا ذریعہ زراعت ہوا کرتا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ ذریعہ ختم ہوا، اب تعلیم (education) انٹرایکشن کا نیا میدان بن گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں سیکولر ایجوکیشن اسی انٹرایکشن کا میدان ہے، لیکن مسلم رہنماؤں نے اس کو نہیں سمجھا۔ انہوں نے علاحدہ تعلیمی ادارے قائم کرکے مسلم نسلوں کو اس انٹرایکشن سے محروم کردیا۔ آج مسلمانوں کو قومی اور اجتماعی زندگی میں جو مسائل درپیش ہیں، اس کا بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمان جدید سماجی دھارے سے الگ ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان کی بستیاں زیادہ تر گھیٹو (ghetto) کی مانند ہیں۔ وہ دوسروں سے دور ہیں اور دوسرے ان سے دور۔ یہ دوری کسی بڑی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

زندگی کا معاملہ

بازار میں تمام چیزیں ضروری قیمت دینے کے بعد ملتی ہیں۔ بازار کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے — جتنا دینا، اتنا پانا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ یہی اصول پوری انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ تم دنیا کو اپنا بہترین دو، اور تمھاری طرف بھی دنیا کا بہترین واپس آئے گا :

Give the world the best you have, and the best will come back to you.

اگر آپ لوگوں کے خیر خواہ ہوں تو لوگ بھی آپ کے خیر خواہ ہوں گے۔ اگر آپ لوگوں سے میٹھا بول بولیں تو لوگوں کی طرف سے بھی آپ کو میٹھے بول کا تحفہ ملے گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والے بنیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ محبت کرنے والے بن جائیں گے۔

یہ دنیا لین دین کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی وہی پاتا ہے جو اس نے دوسروں کو دیا ہو۔ یہاں دوسرے لوگ کسی آدمی کے لیے وہی کچھ ثابت ہوتے ہیں جو کہ وہ خود دوسروں کے لیے ثابت ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اچھا ماحول پانا آدمی کے اپنے اختیار میں ہے۔ آپ دوسروں کے دوست بن جائیے، اس کے بعد آپ کو بھی دوستوں سے بھرا ہوا ماحول مل جائے گا۔ آپ دوسروں کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کیجئے، اس کے بعد آپ بھی اپنے گرد وپیش ایسے پڑوسی پالیں گے جو آپ کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کریں۔ آپ دوسروں کو فائدہ پہنچائیے، اس کے بعد آپ کو بھی زندگی گزارنے کے لیے ایسی دنیا مل جائے گی جہاں ہر ایک آپ کو فائدہ پہنچانے میں مصروف ہوگا۔

اگر آپ پھول بن کر رہنا جانتے ہوں تو آپ خود بخود اپنے رہنے کے لیے پھولوں کی کیاری پالیں گے۔ اور اگر آپ کے وجود کے ساتھ کانٹے لگے ہوئے ہوں تو اس کے بعد آپ کو زندگی گزارنے کے لیے جو دنیا ملے گی وہ صرف کانٹوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہوگا۔ (الرسالہ، جون 1994)

تربیتِ اولاد

میرے گھر کے سامنے ایک پارک ہے، جہاں لوگ چہل قدمی (walking) کے لیے آتے ہیں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ پارک میں آئی۔ بیٹے کی عمر تقریباً آٹھ سال لگ رہی تھی۔ خاتون کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کا بیٹا سائیکل چلا رہا تھا، اور وہ اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے چل رہی تھی تاکہ وہ اپنے بیٹے کو گرنے سے بچائے، یا اگر وہ گر جائے تو اسے فوراً اٹھا سکے۔

ماں بظاہر بیٹے کی ہمدردی میں ایسا کر رہی تھی، مگر نفسیاتی تشکیل کے اعتبار سے وہ اس کے ساتھ ہمدردی نہیں، بلکہ اس کا نقصان کر رہی تھی۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ وہی نقصان تھا جسے نفسیات کی اصطلاح میں Elephant Rope Syndrome کہا جاتا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن میں ہاتھی کو ایک مضبوط رسی یا زنجیر سے باندھا جاتا ہے۔ وہ بار بار کوشش کرتا ہے کہ زنجیر توڑ کر آزاد ہو جائے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے شعور میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ وہ کبھی اس کو توڑ کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ بعد میں جب وہ بڑا اور طاقتور ہو جاتا ہے تو برعکس طور پر اس کو ایک معمولی رسی سے باندھا جاتا ہے، جس کو وہ آسانی سے توڑ سکتا ہے۔ مگر وہ اس کو توڑنے کی کوشش نہیں کرتا، کیوں کہ اس کے ذہن میں یہ یقین بیٹھ چکا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندھن سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

> Baby Elephant Syndrome is where a baby elephant is tied to a strong rope or chain at a young age and is unable to break free of the constraint. When the elephant matures, the elephant has grown strong enough to uproot trees and surely break the rope, but the elephant has been conditioned to accept this constraint. Even if a weak rope is used, the elephant will not attempt to break free. The constraint is now in the mind of the elephant opposed to an actual physical constraint.

یہی معاملہ وہ ماں اپنے بیٹے کے ساتھ کررہی تھی۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے بیٹے کے ذہن میں یہ بات بٹھا رہی تھی کہ اگر زندگی میں اسے کوئی مشکل پیش آئے گی تو وہ خود اس سے نہیں نکل سکے گا، بلکہ اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہوگی جو مشکل کے وقت اس کی مدد کرے۔ حالانکہ یہ طرزِعمل قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ نہ تو ہر وقت ماں موجود رہ سکتی ہے، اور نہ ہی کوئی دوسرا انسان ماں جیسا پُرخلوص ہوتا ہے۔ یہی وہ غلطی ہے جو عام طور پر والدین اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بظاہر والدین اپنے بچوں کی محبت میں ایسا کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اپنے بچوں کو اسی کمزوری کا شکار بنا دیتے ہیں جس کو نفسیات کی اصطلاح میں Elephant Rope Syndrome کہا جاتا ہے۔

والدین کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کے دین وحکمت اور اخلاقی اقدار کے نگراں بن جائیں۔ وہ اپنے بچے کے لیے مذکورہ ماں کی طرح توجہ اور نگرانی رکھیں، مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ ماں اسے صرف وقتی مشکل سے بچانے کے لیے ایسا کر رہی تھی، جب کہ والدین اس انداز سے رہنمائی کریں کہ بچہ بچپن ہی سے خلافِ دین اور خلافِ اخلاق کاموں سے بچنے کی عادت اختیار کرے، وہ اس کو حکمت کی تعلیم دیں۔ یعنی دین، اخلاقی اقدار اور حکیمانہ طرزِعمل کے معاملے میں مکمل نگرانی رکھیں، اور عزم وحوصلہ کے معاملے میں اسے آزاد چھوڑ دیں۔ کیوں کہ ہر بچہ فطری طور پر عزم و حوصلہ کی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

ہر انسان کے اندر اللہ تعالی نے صلاحیت رکھی ہے کہ وہ، ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں، اپنے ''نہیں'' کو ''ہے'' میں بدل سکے۔ اس کے برعکس، دین، اخلاق اور حکیمانہ طرزِعمل وہ امور ہیں، جو کسی انسان کو خود بخود حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق تعلیم و تربیت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا یہی مقصد تھا۔ یہی دینی و اخلاقی تربیت انسان کے عزم اور حوصلے کو غلط رخ پر جانے سے روکتی ہے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے، جتنا کہ فی الواقع وہ ہے۔ یہی تمام جھگڑوں اور شکایتوں کی جڑ ہے۔

کامیاب انسان

کامیاب انسان کی پہچان یہ ہے کہ جب وہ اس دنیا سے جائے تو پیچھے کی سیڑھیاں بنا کر جائے، جس پر چڑھ کر اس کے بعد والے آگے بڑھ سکیں۔ اس کی وضاحت کے لیے میں یہاں ایک مثال پیش کروں گا۔ جنوبی افریقہ کے ناول نگار اولیو شرینز (1920-1855) کی ایک کتاب ہے — افریقی فارم کی کہانی:

Story of an African Farm

اس کتاب کا ایک اقتباس میں نے اپنی کتاب الاسلام کے مقدمہ میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اس میں ایک اجنبی مسافر ایک کسان کے لڑکے کو ایک شکاری کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس شکاری کو سچائی کی خوبصورت سفید چڑیا کی تلاش تھی جس کی ایک جھلک اس نے ایک جھیل کے کنارے دیکھی تھی۔ اس نے خوش اعتقادی کے پھندے اور تصورات کے پنجرے میں چڑیا کو پکڑنا چاہا۔ مگر اسے معلوم ہوا کہ سچائی کو سچائی ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے توہمات کی وادی کو چھوڑ دیا اور سچائی کے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک اونچی کھڑی ہوئی چٹان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اس چٹان کو کاٹ کاٹ کر سیڑھیاں بنانی شروع کیں۔ سالہا سال تک وہ سیڑھیاں بناتا رہا اور اوپر چڑھتا رہا، یہاں تک کہ بوڑھا ہوتے ہوتے وہ اس چوٹی پر پہنچ گیا۔ مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اس کے آگے ایک اور چٹان ہے جو اس سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ مگر اب اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ وہیں مرجاتا ہے۔ تاہم مرتے وقت اوپر سے ایک سفید پر آ کر اس کے پاس گرا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ مطلوب چڑیا اس اگلی چٹان پر ہے۔ اگرچہ وہ خود سچائی کی چڑیا تک نہیں پہنچ پاتا، مگر وہ اس اطمینان کے ساتھ جان دے دیتا ہے کہ میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں بنانی نہیں پڑیں گی۔ وہ پر کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور یہ کہتے ہوئے مرجاتا ہے کہ جہاں آج میں بوڑھا اور کمزور ہو کر گر پڑا ہوں، دوسرے لوگ یہاں سے کھڑے

ہوں گے۔نوجوان اورتازہ دم۔ جوسیڑھیاں میں نے کاٹی ہیں، وہ اس سے چڑھیں گے۔ وہ کبھی نہ جانیں گے کہ سیڑھیاں بنانے والے کا نام کیا تھا۔ مگر وہ ان سیڑھیوں کو چڑھتے رہیں گے اور بالآخر سچائی تک پہنچ جائیں گے:

Where I lie down, worn out, other men will stand, young and fresh. By the steps that I have cut, they will climb; by the stairs that I have built, they will mount. They will never know the name of the man who made them. At the clumsy work, they will laugh; when the stones roll, they will curse me. But they will mount, and on my work; they will climb, and by my stair! They will find her and through me! (*Story of an African Farm* by Olive Schreiner, Chicago, pp. 198-199)

یہی وہ حقیقت پسندانہ طریقہ ہے جو انسان کو اپنے مقصد کی طرف مسلسل آگے بڑھاتا ہے۔ تعمیری کام ہمیشہ درست منصوبہ بندی، بتدریج کوشش کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ ایسے آدمی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ممکن سے آغاز کرتا ہے۔ وہ کبھی ناممکن سے آغاز کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ چھوٹے سے آغاز کرتا ہے، وہ بڑے سے آغاز کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ درست منصوبہ بندی (right planning) سے کام شروع کرتا ہے، وہ کبھی وش فل تھنکنگ (wishful thinking) سے آغاز نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے وہ اپنے کام کا مسلسل جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ کام تو کرے، مگر اس کا جائزہ نہ لے۔

اعلان

قارئینِ الرسالہ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ماہنامہ الرسالہ اکتوبر 1976ء میں جاری ہوا۔ اس طرح اکتوبر 2026ء میں اس کی اشاعت کے پچاس سال مکمل ہو جائیں گے۔ اس مناسبت سے الرسالہ کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ خصوصی شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2026ء کے مشترکہ شمارے کی صورت میں ہوگا — ادارۂ الرسالہ

انسان جاگ اٹھا

24 جنوری 1993 کو میں جبل پور میں تھا۔ یہاں ناگپور کے جناب عبدالسلام اکبانی (پیدائش 1947) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

عبدالسلام اکبانی صاحب نے 1990 میں ناگپور کے ایک ہندو پربھاکر ہزارے سے 6 لاکھ روپے میں ایک زمین کی خریداری کا معاملہ کیا۔ طے ہوا کہ عبدالسلام صاحب بطور ایڈوانس 2 لاکھ روپے مالک کو دے دیں گے۔ چھ ماہ بعد رجسٹری ہوگی اور اسی وقت بقیہ رقم ادا کردی جائے گی۔ دو مہینے کے بعد مالکِ زمین نے کچھ وجہ بتا کر دو لاکھ روپے اور وصول کرلیا۔ اب مالکِ زمین کے ہاتھ میں چار لاکھ روپے آ گیا۔ اس درمیان میں زمین کی قیمت بڑھ گئی۔ اس کے بعد مالک زمین کا ارادہ بدل گیا۔

چھ مہینے کے بعد عبدالسلام صاحب نے مالک زمین سے کہا کہ اب مقرر وقت پورا ہو گیا ہے، اب زمین کی رجسٹری کرادو۔ مگر وہ حیلے والی باتیں کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ ابھی ہمارا ارادہ رجسٹری کرنے کا نہیں ہے۔ اس طرح وہ برابر رجسٹری کے معاملہ کو ٹالتا رہا۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ عبدالسلام صاحب کا چار لاکھ روپے تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ عدالت میں میرے خلاف کیس کریں گے۔ میں مقدمات کا ماہر ہوں۔ ان کو عدالت میں دوڑاتا رہوں گا۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر میری شرطوں پر صلح کرلیں گے۔

ایک روز عبدالسلام صاحب مسٹر ہزارے کے یہاں پہنچے۔ اس وقت وہاں ان کے سسر مسٹر ساور کر بھی موجود تھے۔ ان کا آر ایس ایس سے گہرا تعلق تھا۔ مسٹر ساور کر نے کچھ دل خراش باتیں کہیں۔ آخر میں یہ کہا کہ آپ کیا کر سکتے ہو۔ آپ یہی کرو گے کہ ہمارے خلاف کورٹ میں جاؤ گے۔ اور اگر آپ نے ایسا کیا تو ہم آپ کی چپلیں گھسوا دیں گے۔

عبدالسلام صاحب نے کہا کہ آپ میری چپلیں جب گھسواؤ گے جب کہ میں کورٹ میں جاؤں۔

مگر میں کورٹ میں جاؤں گا ہی نہیں۔ پھر آپ کیسے میری چپلیں گھسواؤ گے۔ مسٹر ساورکر نے کہا کہ پھر آپ کیا کریں گے۔ عبدالسلام صاحب نے کہا کہ میں خود آپ کو ثالث بناؤں گا۔ ایک طرف آپ کا داماد ہے۔ دوسری طرف آپ کا یہ بھتیجا ہے۔ اب آپ کو جو ٹھیک لگے اس کا فیصلہ کردو۔

مسٹر ساورکر کی بیوی اندر بیٹھی ہوئی اس گفتگو کو سن رہی تھی۔ اس نے اشارہ سے مسٹر ساورکر کو بلایا۔ اندر کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مسٹر ساورکر باہر آئے تو وہ بدلے ہوئے تھے۔ اتنے میں مسٹر ساورکر کی بیوی اندر سے چائے لے کر آ گئی۔ مسٹر ساورکر چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اچھا آپ کل آجائیے۔ ہم کل ہی آپ کا فیصلہ کرادیتے ہیں۔ اگلے دن عبدالسلام صاحب وہاں گئے تو مسٹر ساورکر خود اپنی گاڑی پر انھیں لے کر رجسٹرار آفس گئے۔ وہ اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ چنانچہ انھوں نے کوشش کرکے اسی دن زمین کی رجسٹری کرادی۔ عبدالسلام صاحب نے صرف طے شدہ رقم ادا کی۔

اس کے بعد مسٹر ساورکر کا یہ حال ہوا کہ جب بھی وہ سڑک پر ملتے تو گاڑی روک کر عبدالسلام صاحب کو حسب قاعدہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے اور خیریت پوچھتے۔ ایک روز عبدالسلام صاحب اپنے کسی کام سے ہاوسنگ فائننس بورڈ کے دفتر میں گئے۔ اتفاق سے وہاں مسٹر ساورکر بھی موجود تھے۔ مسٹر ساورکر نے جب عبدالسلام صاحب کو دیکھا تو بورڈ کے ڈائرکٹر سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا: میں نے مسلمان تو بہت دیکھے مگر بڈھے آدمی کا جوان باپ ایک ہی بار دیکھا۔ اور وہ یہ عبدالسلام ہے۔ اس نے میرے کو بہت بڑا اسبق سکھایا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آدمی اگر کسی سے مقدمہ نہ لڑے، تو کورٹ میں اس کی چپلیں بھی گھسنے والی نہیں ہیں۔

مسٹر ساورکر اگرچہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک انسان تھے۔ عبدالسلام صاحب نے ان سے جب یہ کہا کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں اور یہ آپ کا داماد ہے۔ آپ خود ہی ثالث بن کر دونوں کے درمیان فیصلہ کر دو، تو انھوں نے اپنے اس قول سے مسٹر ساورکر کے ”انسان“ کو جگادیا یعنی ضمیر کو۔ اور جب کسی کے اندر کا انسان جاگ اٹھے تو وہ ہمیشہ انصاف ہی کا فیصلہ کرتا ہے۔ کسی کے اندر کا انسان ظلم اور بے انصافی کا فیصلہ کرنے پر قادر نہیں۔ (الرسالہ، دسمبر 1993)

قیادت نامہ — ایک تبصرہ

از: علقمہ صفدر قاسمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مولانا وحید الدین خاں کی کتاب ''قیادت نامہ'' میرے لیے ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جس نے میرے سوچنے، سمجھنے اور چیزوں کو دیکھنے کا زاویہ بدل دیا۔ یہ کتاب مسلم قیادت کے موضوع پر بالکل منفرد اور حقیقت پسندانہ زاویے سے لکھی گئی کتاب ہے۔ جہاں ایک طرف اس کے ہر سطر میں حقیقت پسندی نظر آتی ہے، وہیں دوسری جانب مسلمانوں کی سیاست وقیادت کی ناکامی بھی متعین انداز میں واضح ہوتی ہے۔ مولانا وحید الدین خان مسلمانوں کے مسائل کی نہ صرف درست تشخیص کرتے ہیں، بلکہ غلط تشخیص کی بنیاد پر مسلم رہنماؤں اور قائدین نے جو غلط تدبیریں اختیار کیں، ان کی حقیقت بھی نہایت خیر خواہانہ انداز میں واضح کرتے ہیں۔ تعمیر وترقی کے نام پر گزشتہ ایک صدی سے ملت کو جو نقصانات پہنچتے رہے ہیں، مولانا نے ان سب کی کھلے اور بے لاگ انداز میں نشان دہی کی ہے۔

جیسا کہ کتاب کا نام ''قیادت نامہ'' سے ہی ظاہر ہے کہ زیرِ نظر کتاب کن مباحث وموضوعات پر مشتمل ہے اور یہ خصوصاً کن حضرات کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کے ارتقا وتنزلی میں دو قیادتیں ہمیشہ بنیادی کردار ادا کرتی ہیں، ایک مذہبی قیادت اور دوسری سیاسی قیادت۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی دونوں قیادتیں اپنی ذمّہ داریوں کی ادائیگی میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اور دونوں ایک ہی کمزوری میں مبتلا ہیں — اور وہ ہے جذباتی ردّ عمل کا طریقہ۔ دونوں قیادتیں جس طرح کے ردّ عمل میں مبتلا ہیں اس کے ہولناک نتائج ہم اپنی آنکھوں سے روز بروز دیکھ رہے ہیں۔

ہماری مذہبی قیادت زمانی بصیرت سے بے خبری کی بنا پر، جہاں مغرب اور مغربی فکر کے مقابلے میں جذباتی ردّ عمل کا شکار ہو کر بہت سی مفید اور ضروری چیزوں کو ترک کیے ہوئے ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہم ترقی کی دوڑ میں پچھڑتے جا رہے ہیں۔ وہیں ہماری سیاسی قیادت بھی پلورل سوسائٹی میں ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے، جس سے سیکولر سوچ رکھنے والے برادران وطن ہم سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو مولانا صاحب نے اپنی ڈائری میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے، ''ایک

صاحب نے کہا کہ آپ موجودہ مسلم لیڈروں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے بھی ایک کام کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو جگایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی بات میں ایک لفظ کی ترمیم کروں گا۔ ان مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو جگایا نہیں ہے، انھوں نے مسلمانوں کو بھڑکایا ہے۔

عجیب معاملہ ہے کہ یہی بات ہندو حلقہ میں بھی کہی جاتی ہے۔ ہندو دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندو سویا ہوا تھا، ان کے انتہا پسند لیڈروں کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کو جگادیا۔ مگر یہاں بھی وہی بات ہے ان انتہا پسند لیڈروں نے ہندو قوم کو جگایا نہیں ہے، انھوں نے ہندو قوم کو بھڑکا دیا ہے۔ جس دیش کا یہ حال ہو کہ وہاں کے لوگ جگانے اور بھڑکانے کا فرق نہ سمجھتے ہوں وہ دیش ترقی کس طرح کرے گا، اس سوال کا جواب مجھے نہیں معلوم''۔

یہ چند جملے گویا پوری کتاب کی روح کا خلاصہ ہیں۔ قیادت کے لیے جو بنیادی اوصاف ضروری ہوتے ہیں— دور اندیشی، تحمل، حقیقت پسندی، اور قوم کو جگانے اور بھڑکانے کے فرق کی سمجھ۔ ہمارے قائدین بالعموم ان سے ناواقف ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں مولانا نے ایک ایسا واقعہ بھی نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کو ہندستان میں پرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے کس طرح کے رویے کی ضرورت ہے۔ یہ واقعہ گرچہ پرانی صورتِ حال سے متعلق ہے، مگر یہ بعید نہیں کہ ہندستانی مسلمان آج بھی اس طریقے کو اپنا کر بہت حد تک اپنے اور اپنے معاشرے کے لیے ایک نارمل ماحول تخلیق کرسکتا ہے۔ زندگی کے اس فطری قانون کی طرف ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2594)۔ نرم روی جس چیز میں بھی داخل ہوتی ہے، اس کو خوبصورتی عطا کرتی ہے، اور جہاں سے وہ نکل جاتی وہ چیز عیب دار ہوجاتی ہے۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ اس رویے کو اپنانے کی صورت میں اچانک صورتِ حال تبدیل نہ ہو، ہاں یہ بالکل ممکن ہے کہ دھیرے دھیرے ماحول بدلے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ عرب کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی، پہلے وہ ہندستان میں مسلمانوں کے درمیان لیڈری کرتے تھے۔ اس کے بعد انھیں عرب میں ایک اچھا کام مل گیا، اور وہ وہاں منتقل ہوگئے۔ آج کل وہ عرب میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ گفتگو کے

دوران انہوں نے کہا کہ ہندستان کیسا وحشی ملک ہے، وہاں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں جس سے مسلمانوں کی جان ومال محفوظ نہیں۔ آپ دیکھیے ہم لوگ یہاں کتنے سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے، یہاں کا نظام آپ کو جو کچھ دے رہا ہے اس کا آپ نے ذکر کیا مگر آپ خود یہاں کے نظام کو جو کچھ دے رہے ہیں، اس کا ذکر کرنا آپ بھول گئے۔

میں نے کہا کہ آپ جس ڈھنگ سے عرب میں رہتے ہیں، اگر ہندستان کے مسلمان ایسے ڈھنگ سے ہندستان میں رہیں تو وہ ہندستان میں بھی اسی طرح باعزت طور پر رہ سکتے ہیں، جس طرح آپ عرب میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ کیسے؟ میں نے کہا کہ عرب میں آپ کے پرسکون طور پر رہنے کا راز صرف ایک ہے اور وہ یہاں کے نظام کے ساتھ کامل موافقت (ایڈجسٹمنٹ) ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے ملک کے نظام سے اسی طرح موافقت اور ہم آہنگی کے ساتھ رہیں تو ایک دن میں سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔ میں نے کہا کہ ساری عرب دنیا میں وطنی کے مقابلے میں خارجی کو نمبر دو کا شہری سمجھا جاتا ہے، مگر آپ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ یہاں ایک ہندستانی کے مقابلے میں ایک امریکی کو کئی گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے مگر آپ اس امتیاز کو گوارا کیے ہوئے ہیں۔

یہاں آپ کو یہ اجازت نہیں کہ مسجد میں یا مسجد کے باہر لاؤڈ اسپیکر لگا کر تقریر کریں، یہاں آپ نہ کوئی آزاد اخبار نکال سکتے ہیں اور نہ کوئی آزاد رسالہ چھاپ سکتے ہیں۔ مگر اس کے خلاف آپ جیل بھرنے کی مہم نہیں چلاتے، یہاں واضح طور پر بہت سے غیر شرعی امور پر عمل ہو رہا ہے، مگر ان کے بارے میں آپ بالکل خاموش ہیں، آپ حضرات اس قسم کی چیزوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے اور نہ مسائل پر کوئی جلوس نکالتے ہیں۔ میں نے کہا کہ عرب میں آپ کو جو پرسکون زندگی حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں کے نظام سے ہم آہنگی اختیار کر کے آپ نے اس کی ضروری قیمت ادا کر دی ہے، اگر ہندستان کے مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر راضی ہو جائیں تو وہاں بھی وہ عزت اور کامیابی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے اکابر جو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے لیے عرب کا سفر کرتے رہتے ہیں، ان کی زندگیوں میں عام ہندستانی مسلمانوں کے لیے زبردست سبق ہے کہ مسلمان عرب میں جا کر جس طرح وہاں کے

نظام سے موافقت کر کے رہتے ہیں، اسی طرح ہندستانی مسلمان بھی ہندستان کو اپنا ملک سمجھے اور یہاں کے حالات سے موافقت کر کے زندگی گزارے۔ اس کے بعد، ان شاء اللہ، ان کے لیے یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

یہ صورت حال صرف عرب ممالک ہی کی نہیں ہے۔ بلکہ یورپ و امریکہ اور دیگر ممالک کی بھی ہے، جہاں ہر جگہ مسلمان کامل موافقت کے ساتھ رہتے ہیں کہیں بھی کوئی قائدملت حکومت کے خلاف شور و ہنگامہ نہیں کرتا۔ اگر چہ وہاں بھی دسیوں مقامات پر شریعت کے علاوہ دوسرے قوانین نافذالعمل ہیں۔ مگر وہاں کوئی نفاذ شریعت یا تحفظ شریعت کا جلسہ جلوس نہیں ہوتا، اور یہی اس بات کی قیمت ہے جو وہاں پر سارے لوگ امن وسکون کے ساتھ رہتے ہیں۔

اسی لیے ”قیادت نامہ“ محض ایک کتاب نہیں، یہ ایک آئینہ ہے جس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مسلمانوں کی قیادت کا وہ چہرہ دکھایا ہے، جسے دیکھنا تکلیف دہ تو ہے مگر جس سے آنکھیں چرانا مزید تباہ کن ہے۔ جو قوم اپنی کمزوریوں کا سامنا کرنے کے بجائے ان پر پردہ ڈالتی رہے، جو قیادت اپنی قوم کو جگانے کے بجائے بھڑکاتی رہے، اور جو سماج ردِعمل کو حکمتِ عملی سمجھتا رہے اس کا انجام تاریخ کے ہر دور میں یکساں رہا ہے۔

مولانا کا پیغام نہ مایوسی کا ہے، نہ مصلحت کوشی کا۔ بلکہ یہ ایک باشعور، پرحکمت، حقیقت پسند اور دور اندیش قوم بننے کی طرف دعوت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو شکایتوں کی زنجیروں سے آزاد کریں، اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کریں، اور اپنے ماحول سے ٹکراؤ کے بجائے تعمیری ہم آہنگی کا راستہ اختیار کریں۔ یہ راستہ آسان نہیں، مگر یہی وہ راستہ ہے جو تاریخ میں کامیاب اقوام نے اختیار کیا ہے۔

یہ کتاب ہر اس شخص کو ضرور پڑھنی چاہیے جو مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال پر سنجیدگی سے سوچتا ہو، خواہ وہ قائد ہو یا عام فرد — یہ کتاب بتاتی ہے کہ تبدیلی ہمیشہ اوپر یا باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے آتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ”قیادت نامہ“ کا مطالعہ کرنے کے لیے اس QR کوڈ کو اسکین کریں ☜

लेकिन मिकी गलती पर थे। मार्च 1988 की एक सुबह, जब वे अपनी 41 वर्षीय पत्नी ट्रूडी (Trudy) के साथ कैलिफोर्निया के ब्रैडबरी में अपने घर से ऑफिस के लिए निकल रहे थे, तभी दो लोगों ने उन पर बंदूक से हमला कर दिया। ट्रूडी निराशा में कहती रहीं:

"Don't shoot! Don't shoot!"
(मत मारो! मत मारो!)

लेकिन गोलियों की बौछार ने कुछ ही मिनटों में दोनों की जान ले ली। मिकी ने 1960 में 400 मील प्रति घंटे की रफ्तार से कार चलाकर अमेरिका का पहला तेज़ रफ्तार चालक होने का खिताब जीता था। यह यात्रा उन्होंने एक विशेष कार के जरिए की थी, जिसमें चार इंजन लगे थे।

साप्ताहिक "टाइम" (28 मार्च 1988) ने इस घटना पर टिप्पणी करते हुए लिखा:

> "The disregard for danger that marked Thompson's driving career may have led to his death in his own front yard."
>
> (खतरे की परवाह न करना, जिसने मिकी थॉम्पसन को तेज़ रफ्तार का राजा बनाया, वही उनके लिए मौत का कारण बन गया।)

बहादुरी और निडरता अच्छी चीजें हैं। लेकिन इंसान आखिरकार कमज़ोर है; वह असीमित बहादुरी या निडरता का बोझ नहीं उठा सकता। इसलिए बहादुरी और निडरता के साथ यह भी ज़रूरी है कि इंसान सावधान रहे। उसे बुद्धिमानी और विवेक का ख्याल रखना चाहिए।

बिना सोचे-समझे लिया गया जोखिम उतना ही गलत है, जितना कि कायरता से पीछे हटना।

हर इंसान के साथ आते हैं, और ये आते ही रहेंगे, हम इन्हें चाहें या न चाहें।

लेकिन हमारे लिए तसल्ली की बात यह है कि दुनिया का सिस्टम ऐसा बनाया गया है कि अगर यहां विरोध करने वाले लोग हैं, तो उनके साथ सहयोग करने वाले लोग भी मौजूद हैं। जहां रुकावटें खड़ी होती हैं, वहीं संभावनाओं के दरवाजे भी हर ओर खुले रहते हैं।

जो इंसान विरोधों या रुकावटों में उलझकर रह जाता है, वह अपने सफर को पूरा नहीं कर पाता। इसके विपरीत, जो व्यक्ति रुकावटों का सामना करते हुए अपनी सोच को समाधान खोजने की तरफ़ लगा देता है, वह ज़रूर आगे बढ़ने का रास्ता पा लेता है। उसे कोई ताकत उसकी मंज़िल तक पहुंचने से रोक नहीं सकती।

जोश बिना होश

मिकी थॉम्पसन (Mickey Thompson, b. 1928) अमेरिका में पैदा हुआ। उसने कार रेसिंग में अंतरराष्ट्रीय शोहरत हासिल की, यहां तक कि उसे "स्पीड किंग" कहा जाने लगा। लेकिन मार्च 1988 में उसकी गोली मारकर हत्या कर दी गई। उस समय उसकी उम्र 59 वर्ष थी।

मिकी थॉम्पसन बेहद साहसी व्यक्ति थे। नवंबर 1987 में उन्होंने अपने दोस्तों को लॉस एंजेलेस में बताया कि कुछ लोग उन्हें फोन पर जान से मारने की धमकी दे रहे हैं। उनके दोस्त एर्नी अल्वाराडो (Ernie Alvarado) ने बताया कि मिकी को पता था कि कौन उन्हें मारना चाहता है। दोस्त ने पूछा:

"क्या तुमने इसकी सूचना पुलिस को दी है?"

मिकी ने जवाब दिया: "इसकी कोई ज़रूरत नहीं।"

एक अधूरी ज़िन्दगी गुज़ार कर इस दुनिया से चले जाते हैं। हर काम आदमी से उसकी पूरी क्षमता मांगता है। वही शख़्स बड़ी कामयाबी हासिल करता है जो अपनी पूरी क्षमता को एक काम में लगा दे ।

खतरा नहीं

एक विचारक का प्रसिद्ध कथन है:

> "The only thing we have to fear is fear itself."
> (हमारे लिए डरने की एकमात्र चीज़ स्वयं डर ही है।)

ज़िंदगी में ऐसे क्षण आते हैं, जो देखने में ख़तरनाक लगते हैं। इन्हें देखकर इंसान डर जाता है। लेकिन जीवन जीने का सही तरीका यह है कि इंसान खतरे को खतरा न समझे, बल्कि इसे केवल एक "समस्या" के रूप में माने। समस्या मानने से दिमाग़ उसका हल खोजने में लग जाता है। इसके विपरीत, जब समस्या को खतरा समझ लिया जाता है, तो डर की मानसिकता पैदा हो जाती है। इंसान निराश होकर बैठ जाता है और जो कुछ वह कर सकता था, वह भी उसके लिए मुश्किल हो जाता है।

जो व्यक्ति जीवन के संघर्ष के मैदान में उतरता है, उसे सबसे पहले यह जानना चाहिए कि वह अकेला नहीं है। यहाँ उसकी तरह कई और लोग भी हैं, जो अपने हौसले के मुताबिक जीवन के संघर्ष में लगे हुए हैं। उसके साथ प्रकृति का एक व्यापक सिस्टम भी है। इस सिस्टम में सर्दी भी है और गर्मी भी, सूखा भी है और पानी भी, मैदान भी हैं और पहाड़ भी, फूल भी हैं और कांटे भी।

इन दोहरे हालात की वजह से इंसान के सामने कई तरह की रुकावटें आती हैं। बार-बार ऐसा होता है कि उसकी गाड़ी रुकती हुई नज़र आती है। ऐसे हालात

पाल डिरॅक के नाम के साथ क्वांटम मेकानिकल थ्योरी (Quantum Mechanic Theory) जुड़ी हुई है। यह साइंसी नज़रिया (सिध्दांत) एटम के बेहद छोटे ज़र्रात (कणों) के बारे में है। उन्होंने सबसे पहले एंटी मीटर की पेशीनगोई (भविष्यवाणी) की जो बाद में ज़्यादा तहक़ीक़ात से साबित हो गया। गार्जियन (4 नवम्बर 1984) ने पाल डिरॅक पर लेख छापा तो उसकी सुर्ख़ी इस तरह लगाई:

Prophet of the Anti-Universe.

पाल डिरॅक ने एटम में पहला एंटी पार्टिकल खोजा, जिसे पाज़िट्रान (Positron) कहा जाता है। 'इस खोज ने न्यूक्लेयर फ़िज़िक्स में एक इंक़िलाब बरपा कर दिया। लोग जब पाल डिरॅक से पूछते कि आपने सब-एटोमिक की नौइयत (प्रकृति) और विशेषताओं के बारे में अपना चौंका देने वाला नज़रिया कैसे खोज निकाला तो वह बताते कि वह अपने स्टडी रूम में इस तरह फ़र्श पर लेट जाते थे कि उनका पाँव ऊपर रहता था ताकि ख़ून उनके दिमाग़ की तरफ़ दौड़े:

> When people asked him how he got his startling ideas about the nature of sub-atomic matter, he would patiently explain that he did so lying on the floor of his study with his feet up so that the blood rushed to his head.

देखने में यह एक लतीफ़ा लगता है। लेकिन हक़ीक़त यह है कि कोई बड़ा फ़िक्री और बौद्धिक काम वही शख़्स कर पाता है जो अपने सारे जिस्म का ख़ून अपने दिमाग़ में समेट दे।

ज़्यादातर लोगों का हाल यह होता है कि वे अपनी क्षमता को विभाजित किए हुए होते हैं। वे अपने आपको एक केन्द्र पर एकाग्र नहीं कर पाते इसीलिए वे

coach and I know that I have reserves which we must put to use."

(सबसे महत्वपूर्ण है अपनी उन कमज़ोरियों को दूर करना, जो मेरी प्रदर्शन क्षमता को बेहतर बनाने में बाधा डालती हैं। मेरे कोच और मैं दोनों जानते हैं कि मुझमें छुपी हुई क्षमताएं हैं, जिन्हें हमें उपयोगी बनाना है।)

रॉबर्ट एम्मियन ने खेल में सफलता का जो राज़ बताया, वही ज़िंदगी में सफलता का भी राज़ है। जीवन के संघर्ष में जब कोई व्यक्ति असफल होता है, तो वह अपनी ही कमज़ोरियों के कारण असफल होता है। अपनी आंतरिक कमज़ोरियों को पहचानना और उन्हें दूर करके बेहतर तैयारी के साथ आगे बढ़ना ही सफलता का मूल मंत्र है।

इस दुनिया में जो भी व्यक्ति सफल होता है, वह इस शर्त को पूरा करके ही सफल होता है। और जो असफल होता है, वह इसलिए असफल होता है कि वह इस शर्त को पूरा नहीं कर सका। असफल वह है, जो अपनी पूरी क्षमताओं का इस्तेमाल करने में नाकाम रहे, और सफल वह है, जो अपनी पूरी क्षमताओं का इस्तेमाल करने में सफल हो जाए।

शरीर का सारा खून

प्रोफ़ेसर पाल डिरॅक (Paul Dirac) 1902 में पैदा हुए। अक्तूबर 1984 में उनकी 82 साल की उम्र में फ्लोरिडा में मृत्यु हुई। वह आधुनिक दौर में न्यूटन (Newton) और आइंस्टाइन (Einstein) के बाद सबसे ज़्यादा मुमताज़ और बड़े साइंसदां समझे जाते हैं। उनको नोबेल प्राइज़ और दूसरे बहुत से इनाम व सम्मान हासिल हुए ।

इंसान को यह अधिकार है कि वह सच्चाई का इनकार कर दे। लेकिन सच्चाई को बदलना उसके लिए संभव नहीं। इंसान को यह अधिकार है कि वह बगावत करे, लेकिन बगावत के नतीजों से खुद को बचाना उसके लिए संभव नहीं। इंसान को यह अधिकार है कि वह नैतिकता के नियमों को न माने, लेकिन नैतिकता की अहमियत को इस दुनिया से खत्म करना उसके बस में नहीं।

इंसान को यह अधिकार है कि वह जो चाहे करे, लेकिन उसे यह अधिकार नहीं है कि अपनी किसी चाहत को उस आदर्श सिद्धांत की हैसियत दे दे, जिसके आधार पर आखिरकार सभी इंसानों का फैसला किया जाएगा।

इंसान इस दुनिया में आज़ाद है, लेकिन उसकी आज़ादी सीमित है, न कि असीमित।

अपनी कमज़ोरी

रॉबर्ट एम्मियन (Robert Emmiyan) रूस के प्रसिद्ध एथलीट हैं। उन्हें लंबी कूद के चैंपियन (Top Long-Jumper) के रूप में जाना जाता है। वे 15 फरवरी 1965 को पैदा हुए और अंतरराष्ट्रीय प्रतियोगिताओं में गोल्ड मेडल जीतकर असाधारण शोहरत हासिल की।

एक भारतीय पत्रकार श्री वी. कृष्णास्वामी ने रॉबर्ट एम्मियन का विस्तृत इंटरव्यू लिया। यह इंटरव्यू टाइम्स ऑफ इंडिया (5 अप्रैल 1988) में प्रकाशित हुआ। श्री कृष्णास्वामी ने रॉबर्ट से पूछा कि अंतरराष्ट्रीय खेलों में सफलता पाने के लिए आप क्या करते हैं। रॉबर्ट एम्मियन ने जवाब दिया:

> "The most important is to get rid of the defects which prevent me from improving my performance. My

अधिकार और लाचारी

प्रसिद्ध वैज्ञानिक आइंस्टीन (Einstein) ने भौतिक विज्ञान के एक सिद्धांत को इस तरह बयान किया है:

"Energy can neither be created nor destroyed."

(ऊर्जा न उत्पन्न की जा सकती है और न नष्ट की जा सकती है।)

यह तथ्य ईश्वर की असीम शक्ति का प्रमाण है। इंसान इस दुनिया को सिर्फ इस्तेमाल कर सकता है। वह इसे बदलने या मिटाने में सक्षम नहीं है। इससे यह भी पता चलता है कि इस दुनिया में इंसान की असली हैसियत क्या है। इंसान इस दुनिया का मालिक नहीं है, बल्कि एक अधीन व्यक्ति है। इसी स्थिति को धार्मिक शब्दों में "परीक्षा" कहा जाता है।

इंसान इस दुनिया में इसलिए आता है ताकि वह सीमित समय के भीतर अपनी परीक्षा का उत्तर लिख सके। इसके बाद उसे यहां से चले जाना होगा। इसके अलावा किसी और चीज़ पर उसे कोई पूर्ण अधिकार नहीं।

कुछ लोग दुनिया की परेशानियों से हार मानकर आत्महत्या का रास्ता चुन लेते हैं। उन्हें लगता है कि खुद को मिटाकर वे अपनी समस्याओं का अंत कर देंगे। लेकिन यह सोचना एक भ्रांति है। जैसे भौतिक दुनिया की ऊर्जा को नष्ट नहीं किया जा सकता—क्योंकि वह किसी न किसी रूप में बनी रहती है—उसी तरह उस ऊर्जा को भी समाप्त नहीं किया जा सकता जो एक इंसान के रूप में अस्तित्व में आई है। जीवन कोई मिटने वाली चीज़ नहीं, बल्कि एक निरंतरता है, जो इस दुनिया से आगे भी अपना स्वरूप बनाए रखती है।

यह स्थिति इस बात का संकेत है कि इस दुनिया में इंसान का असली मामला क्या है।

पत्नी ने शराब के लिए पैसे देने से इनकार कर दिया। इस पर पति-पत्नी के बीच झगड़ा हुआ। इसके बाद टाइम्स ऑफ इंडिया (29 मई 1990) के मुताबिक़ जो हुआ, वह यह था:

> "The accused Anant Ram, a habitual drunkard, was enraged when his wife refused to give him the money he asked for. Giving way to his tantrums, he dashed his son Arjun against the floor, thus killing him then and there."

अनंत राम, जो शराब का आदी था, जब उसकी पत्नी ने पैसे देने से मना कर दिया, तो वह गुस्से में आग बबूला हो गया। गुस्से में आपा खोकर उसने अपने 2 साल के बेटे (अर्जुन) को कई बार उठाकर ज़मीन पर पटक दिया। इसके नतीजे में बच्चा वहीं मौके पर मर गया।

जब इंसान गुस्से में होता है, तो उस समय वह शैतान के क़ब्ज़े में होता है। उस वक्त वह किसी भी अमानवीय हरकत को अंजाम दे सकता है, यहां तक कि अपने ही बच्चे की निर्दयता से हत्या भी कर सकता है।

यह एक ऐसी कमज़ोरी है जो हर इंसान के अंदर मौजूद होती है। समाज में सुरक्षित और कामयाब ज़िंदगी गुज़ारने का तरीका यह है कि इंसान दूसरों को गुस्सा दिलाने से बचे। समझदारी से कोशिश करे कि कोई भी व्यक्ति उस भावनात्मक स्थिति तक न पहुंचे, जब वह शैतान के क़ब्ज़े में चला जाए और पागलपन भरी हरकतें कर बैठे, जैसा कि ऊपर के वाक्य में देखा गया।

गुस्सा और बदले की भावना किसी विशेष क़ौम या समुदाय से जुड़ी नहीं है। यह हर इंसान के स्वभाव का हिस्सा है, चाहे वह किसी भी क़ौम या देश का हो। गुस्से और बदले को "मानवीय समस्या" के तौर पर लेना चाहिए, न कि किसी विशेष क़ौम या समुदाय की समस्या के तौर पर।

नाकाम रहा है। मुस्लिम जनता इस "उकसावे" पर भड़क उठती, झगड़े शुरू हो जाते, और उसके बाद सांप्रदायिक दंगे होते, जिनका नतीजा यह होता कि मुसलमान समाज और पीछे चला जाता।

लेकिन जापानी उद्योगपतियों ने इस "उकसावे" पर ग़ुस्से का कोई इज़हार नहीं किया। उन्होंने सिर्फ़ एक काम किया — अपने कंप्यूटरों की गुणवत्ता को बेहतर बनाने में लग गए। और नतीजा यह हुआ कि टाइम मैगज़ीन (17 सितंबर 1990) के मुताबिक जापान कंप्यूटर उद्योग में पूरी दुनिया से आगे निकल गया। आज जापान की स्थिति यह है कि फुजित्सु (Fujitsu) कंपनी ने कहा कि उसके नए, बड़े कंप्यूटर प्रति सेकंड 600 मिलियन निर्देशों को पूरा कर सकते हैं, जबकि अमेरिकी आईबीएम के सर्वश्रेष्ठ कंप्यूटर की गति केवल 210 मिलियन निर्देश प्रति सेकंड है।

> Fujitsu said its largest new computer can perform up to 600 million instructions per second, compared with up to 210 MIPS for IBM's best. (p.47)

उकसावे पर भड़क उठना प्रतिक्रिया (reaction) है, और उकसावे को नज़रअंदाज़ कर अपने निर्माण और मज़बूती पर ध्यान देना कर्म (action) है। इस दुनिया का नियम साफ़ है — जो लोग कर्म पर ध्यान देते हैं, वे तरक्क़ी करते हैं; और जो प्रतिक्रिया में उलझे रहते हैं, वे बर्बाद हो कर रह जाते हैं।

गुस्सा न दिलाओ

29 मई 1990 को दिल्ली के अखबारों में एक सीख देने वाली खबर प्रकाशित हुई। सुदर्शन पार्क (मोती नगर) की झुग्गियों में रहने वाला एक व्यक्ति था, जिसका नाम अनंत राम था। उसकी उम्र 35 साल थी। वह शराब का आदी था। जब उसके पास शराब के लिए पैसे नहीं थे, उसने अपनी पत्नी से पैसे मांगे।

क़ीमत का मतलब लड़ना या खून बहाना नहीं है, और इसका संबंध सिर्फ़ धन से भी नहीं है। इसका सबसे गहरा रिश्ता मनोविज्ञान से है। इस दुनिया में सबसे बड़ी क़ीमत वही है जो मानसिक स्तर पर अदा की जाती है। मानसिक क़ीमत का अर्थ है नागवार बातों को बर्दाश्त करना, ग़ुस्से के बावजूद शांत रहना, दूसरों के अनुचित व्यवहार पर भी बदले में बुरा व्यवहार न करना, निराशाजनक परिस्थितियों में भी हौसला न खोना, नुक़सान के बाद भी उम्मीद बनाए रखना, अंधेरे हालात में भी रोशनी की किरण देख लेना।

सबसे बड़ी कुर्बानी यह है कि इंसान के सीने में ग़ुस्से और बदले की आग भड़क उठे, मगर वह उसे अपने भीतर ही बुझा दे। कोई उसे तकलीफ़ दे, फिर भी वह उसके बारे में बदगुमान न हो। अगर इंसान का सामना नकारात्मक परिस्थितियों से हो, तब भी वह सकारात्मक सोच पर क़ायम रहे — हालात से ऊपर उठकर जिए, हालात के भीतर नहीं।

कर्म, न कि प्रतिक्रिया

अमेरिका की कंपनी आईबीएम (IBM) कंप्यूटर के क्षेत्र में इतनी आगे थी कि उसे कंप्यूटर की दिग्गज कंपनी (computer giant) कहा जाता था। कुछ साल पहले इसके अधिकारियों ने जापान की कंप्यूटर बनाने वाली कंपनियों का मज़ाक उड़ाते हुए कहा था — "जब आईबीएम छींकती है, तो जापान के कंप्यूटर निर्माता उड़ जाते हैं।"

> When IBM sneezes, Japanese computer makers are blown away.

अगर भारत में मुसलमानों के खिलाफ़ कोई हिंदू ऐसी बात कह देता, तो सभी नासमझ मुस्लिम नेता और तीसरे दर्जे के अखबार तुरंत शोर मचा देते कि मुसलमानों के जज़्बात को ठेस पहुँची है, मगर प्रशासन अपने कर्तव्यों में

अनुकूलता और सहनशीलता अपनाई जाए। हर पुरुष या स्त्री में अच्छाई भी होती है और कमी भी; ज़रूरत इस बात की है कि अच्छाइयों पर ध्यान दिया जाए और कमियों को बर्दाश्त किया जाए। व्यावहारिक रूप से यही एक संभव तरीक़ा है— इसके सिवा और कोई तरीक़ा इस दुनिया में असरदार नहीं।

क़ीमत का मसला

मौलाना फ़रीद अल-वहीदी जद्दा में रहते हैं। उन्होंने 1 नवंबर 1991 की एक मुलाक़ात में एक बहुत अर्थपूर्ण वाक्य कहा: जो व्यक्ति माउंट एवरेस्ट पर विजय प्राप्त करना चाहता है वह कभी अपने जूतों की क़ीमत नहीं देखता।

> One who wants to conquer the Mount Everest never counts the cost of his shoes.

अगर आपके सामने छोटा मक़सद हो तो आप उसे मामूली कोशिश से हासिल कर सकते हैं। लेकिन अगर आपने अपने लिए कोई बड़ा लक्ष्य चुना है, तो यह भी समझना होगा कि बड़ा लक्ष्य बड़ी क़ीमत भी माँगता है। जो व्यक्ति बड़ा मक़सद पाना चाहता है, उसे बड़ी क़ीमत चुकाने के लिए भी तैयार रहना चाहिए।

बड़ी कामयाबी किसी की जागीर नहीं। हर इंसान बड़ी कामयाबी तक पहुँच सकता है। इसके बावजूद हम देखते हैं कि बहुत कम लोग बड़ी कामयाबी हासिल करते हैं, और इसकी वजह यही है कि वे उस कामयाबी की क़ीमत नहीं देते। बाज़ार में कम कीमत पर कम चीज़ मिलती है और ज़्यादा कीमत पर ज़्यादा चीज़ — यही ज़िंदगी का उसूल है। ज़िंदगी का क़ानून एक शब्द में ये है: जितना दोगे, उतना ही पाओगे — न उससे कम, न उससे ज़्यादा।

एक नसीहत

बेंजामिन फ्रैंकलिन एक अमेरिकी विचारक था। वह 1706 में पैदा हुआ और 1790 में उसका निधन हुआ। उसका एक प्रसिद्ध कथन है— शादी से पहले अपनी आँखें पूरी तरह खुली रखो, लेकिन शादी के बाद आधी बंद कर लो।

> Keep your eyes open before marriage, half shut afterwards.

इसका मतलब यह है कि विवाह से पहले अपने जीवन साथी के बारे में पूरी जानकारी हासिल करो, मगर विवाह के बाद बातों को कम से कम जानने की कोशिश करो, अधिक छानबीन न करो। इसी बात को किसी ने सरल शब्दों में यूँ कहा कि "शादी से पहले परखो, और शादी के बाद निभाओ।"

कोई भी व्यक्ति पूर्ण या आदर्श नहीं। इसलिए रिश्ता तय करने से पहले जाँच-पड़ताल ज़रूर करनी चाहिए, लेकिन रिश्ता होने के बाद अपने जीवन साथी की अच्छाइयों को देखना चाहिए और उसकी कमियों को नज़रअंदाज़ करना चाहिए।

इस दुनिया में पूर्णता या आदर्श प्राप्त करना असंभव है। साथ ही यह भी ज़रूरी नहीं कि जो चीज़ एक व्यक्ति को आदर्श लगे, वही दूसरे को भी वैसी ही लगे। इस आधार पर चाहे कोई व्यक्ति कितना भी सही हो, वह दूसरे को पूरी तरह संतुष्ट नहीं कर सकता। दोनों पक्षों को एक-दूसरे में कुछ न कुछ कमियाँ ज़रूर दिखेंगी।

अब एक रास्ता यह है कि दूसरे की कमी पर झगड़ो और रिश्ता तोड़ लो, लेकिन मुश्किल यह है कि नए रिश्ते में भी जल्दी ही कोई और कमी सामने आ जाएगी। अगर दूसरा रिश्ता भी तोड़ दिया जाए और तीसरा या चौथा बनाया जाए, तो उनमें भी वही बात दोहराई जाएगी। इसलिए समझदारी का तरीक़ा यही है कि

है और सही सोच सफलता की ओर। यहां मिस्टर प्रमोद कुमार बत्रा की एक खूबसूरत छपी हुई अंग्रेज़ी किताब थी। इसका नाम "मैनेजमेंट थॉट्स" (Management Thoughts) था। इसमें कुल 315 पन्ने और 1360 उपयोगी कथन शामिल थे। उदाहरण के तौर पर एक कथन यह था:

"Our attitude determines our altitude."

(हमारा मानसिक रवैया हमारी ऊंचाई को निर्धारण करता है।)

इसी तरह, इस स्टॉल पर कई प्रेरणादायक पोस्टर भी थे। एक पोस्टर में ऊपर माचिस की एक तीली दिखाई गई थी। उसके नीचे लिखा था कि माचिस की तीली का एक सिर होता है, लेकिन उसमें दिमाग नहीं होता। इसलिए जब भी रगड़ होती है, वह तुरंत जल उठती है। हमें इस छोटी सी माचिस की तीली से सीखना चाहिए। हम और आप सर रखते हैं और इसी के साथ दिमाग भी, इसलिए हमें चाहिए कि हम भड़कें नहीं:

"A match-stick has a head, but it does not have a brain. Therefore, whenever there is a friction, it flares up immediately. Let us learn from this humble match-stick. You and we have heads as well as brains. Therefore, let us not react on impulse."

एक इंसान वह है जो भड़काने वाली बात पर तुरंत भड़क उठता है। वह फौरन भावनाओं में आकर प्रतिक्रिया देता है। ऐसा इंसान हमेशा नाकाम रहेगा। दूसरा इंसान वह है जो भड़काने वाली बात के बावजूद संयम में रहता है। वह ठंडे दिमाग से सोचता है, फिर कार्रवाई करता है। ऐसा इंसान हमेशा कामयाब रहेगा। दूसरा इंसान वास्तव में "इंसान" है, जबकि पहला सिर्फ माचिस की एक तीली है।

दूसरे विश्व युद्ध तक जापान का यह हाल था कि "मेड इन जापान" (Made in Japan) शब्द जहां भी लिखा होता, लोग समझते कि यह सस्ता और अविश्वसनीय होगा। जापानी सामान की छवि इतनी खराब थी कि पश्चिमी देशों के व्यापारी जापानी सामान अपनी दुकानों पर रखना अपमान समझते थे। फिर सिर्फ 40 वर्षों में जापान ने इतनी क्रांतिकारी तरक्की कैसे हासिल कर ली?

एक अमेरिकी विद्वान विलियम ओयूची (William O'uchi) के अनुसार, इसका रहस्य उनके कर्मचारियों के अंदर "प्रेरणा" (motivation) पैदा करना है।

जापानियों ने अपनी प्राथमिक शिक्षा का स्तर बहुत ऊंचा किया। उन्होंने प्राथमिक शिक्षकों को ऊंची तनख्वाह और प्रोफेसरों जैसी इज़्ज़त दी, ताकि बेहतरीन शिक्षक उनकी नई पीढ़ी को शिक्षा दे सकें। उन्होंने अपने लोगों में गहराई से यह चेतना पैदा की कि उद्योग में सबसे महत्वपूर्ण चीज़ "गुणवत्ता" (Quality) है।

आधुनिक जापान में हर जगह क्वालिटी कंट्रोल सर्कल स्थापित हैं। 1980 तक एक लाख क्वालिटी कंट्रोल सर्कल पंजीकृत हो चुके थे। इसके अलावा, कहा जाता है कि जापान में दस लाख गैर-पंजीकृत क्वालिटी सर्कल भी मौजूद हैं।

सफलता कैसे

फरवरी 1992 में दिल्ली में किताबों की प्रदर्शनी (book fair) आयोजित हुई। 7 फरवरी को मैं भी इसे देखने गया। अलग-अलग स्टॉल देखते हुए एक जगह पहुंचा, तो वहां के बोर्ड ने मेरा ध्यान खींच लिया। बोर्ड पर लिखा था: "थिंक इनकॉर्पोरेटेड" (Think Incorporated)।

यह बुक फेयर में एक अनोखा स्टॉल था। इसका मकसद था लोगों को सोचने की कला सिखाना। क्योंकि गलत सोच इंसान को नाकामी की ओर ले जाती

व्यक्तिगत मामलों में "सही" (right) पर चलने से ज़िंदगी का सफर रुकता नहीं, बल्कि जारी रहता है। लेकिन सामूहिक मामलों में ऐसा करने पर दूसरे पक्ष का विरोध आपके सफर को तुरंत रोक देता है। तब सफर को टाल कर सारी ऊर्जा विवाद में खर्च होने लगती है।

इसलिए बेहतर और कामयाब तरीका ये है कि दूसरे पक्ष की बात का ध्यान रखते हुए जो भी रास्ता निकल रहा हो, उसे अपना लिया जाए। वर्तमान को भविष्य पर छोड़ते हुए अपना सफ़र जारी रखा जाए। दुनिया में ज़िंदगी गुज़ारने का यही समझदारी भरा तरीका है।

चेतना का निर्माण

दूसरे विश्व युद्ध तक अमेरिका पूरी दुनिया में मोटर कार का सबसे बड़ा व्यापारी था। हर व्यक्ति के दिमाग़ में "रोल्स रॉयस" कार का दबदबा छाया हुआ था। दूसरे विश्व युद्ध के बाद जर्मनी की "वोक्सवैगन" का दौर आया। 1970 तक 140 देशों में 16 मिलियन से अधिक वोक्सवैगन कारें बिक चुकी थीं। मगर अब जापानी कारों का ज़माना है। आज "टोयोटा" (न कि जनरल मोटर्स) कारों की दुनिया का बादशाह है। अमेरिका की सड़कों पर जो कारें दौड़ती हैं, उनमें से 35% कारें जापान की बनी हुई होती हैं।

आज दुनिया में इस्तेमाल होने वाले इलेक्ट्रॉनिक सामान का 80% जापान में बना हुआ होता है। जब अमेरिका का अपोलो (II) चांद पर गया, तो उसमें रखने के लिए एक बेहद छोटा और सटीक काम करने वाला कैसेट रिकॉर्डर चाहिए था। इतना छोटा और सही काम करने वाला रिकॉर्डर सिर्फ जापान ही बना सकता था। नतीजतन, अपोलो II के साथ जापानी रिकॉर्डर रखकर उसे चांद पर भेजा गया।

हिकमत वाला तरीक़ा

ज़िंदगी में बार-बार ऐसा होता है कि इंसान को यह फ़ैसला लेना पड़ता है कि वह क्या करे और क्या न करे। ऐसे मौकों पर फ़ैसला लेने के दो आधार होते हैं:

1. What is right (क्या सही है)
2. What is possible (क्या संभव है)

हिकमत भरा तरीका यह है कि व्यक्तिगत मामलों में इंसान यह देखे कि क्या सही है, और जो तरीका सही हो, उसे अपनाए। लेकिन सामूहिक मामलों में यह देखना सही होता है कि क्या संभव है, और जो चीज़ संभव हो, उसे अपना लिया जाए।

इस फ़र्क की वजह यह है कि व्यक्तिगत मामलों में पूरा मसला सिर्फ अपनी ज़ात का होता है। आपको अपनी ज़िंदगी पर पूरा अधिकार है। आप अपनी ज़िंदगी को जिस दिशा में चाहें, मोड़ सकते हैं और अपने साथ जैसा चाहें व्यवहार कर सकते हैं। इसलिए व्यक्तिगत मामलों में आपको आदर्शवादी होना चाहिए और जितना हो सके, वही रवैया अपनाना चाहिए जो धर्म और नैतिकता की दृष्टि से उचित हो।

लेकिन सामूहिक मामलों में आपकी ज़िंदगी के साथ एक दूसरा पक्ष भी जुड़ जाता है। उस बाहरी पक्ष पर आपका कोई अधिकार नहीं होता। आप उससे अनुरोध कर सकते हैं, लेकिन उसे मजबूर नहीं कर सकते। ऐसे हालात में समझदारी की बात यह है कि सामूहिक मामलों में "संभव" (possible) को देखा जाए। दो विकल्पों में से जो विकल्प व्यवहारिक रूप से संभव हो, उसे स्वीकार कर लिया जाए।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

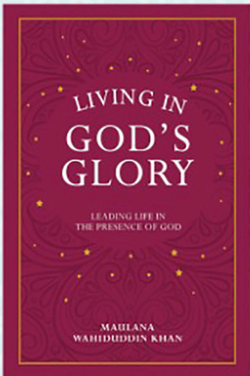

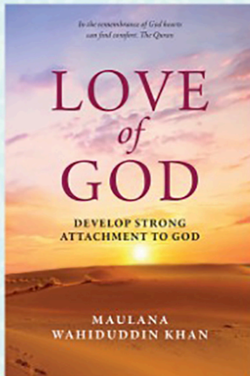

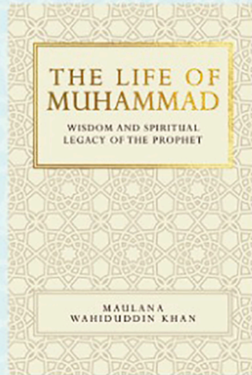

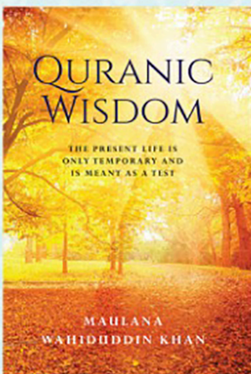

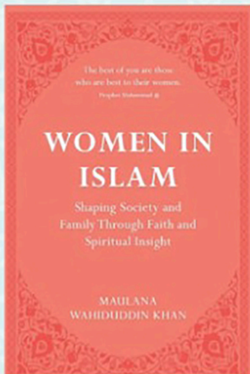

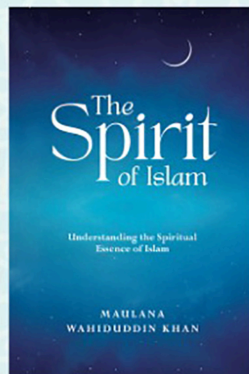

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23